آپ کا شکریہ

اس کرہ ارض پر انسان خدا کی سب سے شاندار تخلیق ہے۔ انسان کی فضیلت کے ہزار ہا پہلو ہیں لیکن سب سے بڑا پہلو انسان کی تخلیقی صلاحیت ہے جس کا نقطہ عروج انسان کی قوت بیان ہے۔ انسان اپنی زبان وقلم سے احساسات، مشاہدات اور تاثرات کو جس خوبی و کمال کے ساتھ ادا کرتا ہے وہ بلاشبہ جان تخلیق ہے۔ مگر اس صلاحیت و استعداد کے ساتھ انسان کو اس دنیا میں ہزار طرح کے عجز لاحق ہیں۔ مگر ان میں سب سے بڑا عجز یہ ہے کہ انسان غیر معمولی قوت بیان رکھنے کے باوجود اپنے مالک کی حمد کرنے سے مکمل طور پر قاصر ہے۔

کلام ؛نظم ،نثر، خطبہ، مضمون یا اور کسی شکل میں ہو اپنے جمال و ابلاغ کے لیے بہرحال اسالیب زبان کا محتاج ہوتا ہے۔ مگر خدا کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی بڑائی اور اس کی ثنا ہر اسلوب سے بالاتر ہے۔ خدا کی حمد کس تشبیہ سے بیان ہو ،اس جیسا کوئی نہیں۔ خدا کی تعریف کس استعارے میں سمائے ،اس کا سا جمال کسی میں نہیں۔ خدا کی تمثیل کس کے روپ سے دی جائے، مالک دو جہاں تو بے مثل ہے۔ اس کا تقابل کس سے کیا جائے ،اس کے مقابلے کا کوئی نہیں۔ اس کا ذکر کیسے ہو، وہ ہر جگہ مذکور ہے۔ اس کو حذف کیسے کیا جائے ، وہ ہر ظاہر کا باطن ہے۔ وہ کمال کی جس عظمت پر ہے وہاں اطناب وتفصیل کی کوئی راہ جاتی ہے نہ ایجاز و اختصار کا کوئی شارٹ کٹ پہنچتا ہے۔ وہ جمال کے جس مقام پر ہے وہ حقیقت سے بیان ہوسکتا ہے نہ کسی مجاز سے۔

ایسے میں انسان کا واحد سہارا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں جو خدا کے سب سے بڑے عارف تھے۔ اللهم لا نحصی ثناء عليك انت كما اثنيت على نفسك ۔ یہ حقیقت خدا کے آخری نبی ہی بتا سکتے تھے کہ خدا کی تعریف اور ثنا کرنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ وہ ویسا ہی ہے جیسا اس نے خود کو سراہا ہے۔ یا رسول اللہ آپ کا شکریہ۔

رحمت للعالمین

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہانوں کے لیے اپنی رحمت قرار دیا ہے۔ اس رحمت للعالمین ہونے کے اتنے پہلو ہیں کہ کئی ہزار صفحات بھی اس کی تفصیل کے لیے ناکافی ہیں۔ مگر اس کا اہم ترین پہلو وہ ہے جس کا تعلق مجھ سے اور آپ سے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو جنت کے حصول کی جدوجہد کے لیے بھیجا ہے۔ لیکن نبی آخر الزماں سے قبل یہ جدوجہد بدترین مصائب اور تکالیف سے عبارت تھی۔ اُس دور میں ایک اللہ کا نام لینے پر لوگوں کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر انھیں سولی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ زندہ انسانوں کو بھڑکتی ہوئی آگ میں پھنکوا دیا جاتا تھا۔ مگر یہ آپ کی جدوجہد کا ثمرہ ہے کہ آج ایمان لانے اور اس کے تقاضوں پر عمل کرنے میں انسان کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ آج عقیدے کی بنیاد پر کسی کو عذاب نہیں دیا جاتا۔ لوگ غیر مسلم ممالک میں رہ کر بھی اطمینان کے ساتھ دین پر عمل کر سکتے ہیں۔

آپ سے پہلے نبوت کا سلسلہ جاری تھا۔ لوگ گمراہ ہوتے اور اپنے تعصّبات کو حق سمجھ لیتے۔ جب نیا نبی آتا تو وہ اس کا کفر کرتے اور یوں جہنم کے مستحق ہو جاتے۔ مگر آپ کے ساتھ نبوت کو ختم کر کے آپ کی تعلیم کو محفوظ کر دیا گیا۔ یوں نہ اب کسی نئے نبی نے آنا ہے نہ اس کا انکار کفر کا باعث ہوگا۔ یہ بات نہ ہوتی تو بنی سرائیل کی طرح تعصّبات کا شکار مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت نئے نبی کا انکار کر کے کفار کے زمرے میں چلی جاتی۔

پھر آپ سے قبل یہود و نصاریٰ نے دین کی اصل تعلیم کو اپنی گمراہیوں میں اس طرح کھو دیا تھا کہ عام آدمی کے لیے آسمانی کتابوں کے ہوتے ہوئے بھی سچائی کو جاننا مشکل ہو گیا تھا۔ مگر آپ کی تعلیم یعنی قرآن اب ہر شخص کی دسترس میں ہے۔ اس میں جگہ جگہ انتہائی واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ جنت میں جانے کے لیے کیا کرنا ہے۔ اس پہلو سے بھی جنت کا حصول کبھی اتنا آسان نہیں ہوا تھا۔ یہ بھی آپ ہی کی عطا کردہ رحمت ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

فضیلت، محبت، اطاعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی مسلمانوں کے ہاں جس پہلو سے سب سے زیادہ قابل ذکر رہتی ہے وہ آپ کی فضیلت اور محبت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ایک ناقابل انکار حقیقت اور آپ کی محبت ایمان کا ناگزیر حصہ ہے۔ مگر ایک سوچنے والے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو چیز اتنی زیادہ مسلمہ ہے، جس کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف ڈھونڈنا ایک مشکل کام ہے، وہ مسلمانوں کے ہاں اس قدر زیر بحث کیوں رہتی تھی۔ اس سوال کا سادہ ترین جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا بیان مسلمانوں کے فخر کے جذبات کی تسکین کرتا ہے اور آپ کی محبت کا دعویٰ اپنی نجات پر وہ اعتماد پیدا کرتا ہے جس کے بعد اخلاق کی مشکل گھاٹی پر چڑھنا ضروری نہیں رہتا۔

اس کے برعکس مسلمانوں میں وہ چیزیں سب سے کم زیر بحث ہیں جو آپ کی اصل دعوت تھیں اور جن پر مسلمانوں کی نجات موقوف ہے۔ یعنی ایمان اور عمل صالح۔ ایمان کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو اپنی زندگی کا مرکزی خیال اور اس کے حضور پیشی کے موقع پر جنت کی فلاح کو اپنی زندگی کا مقصد بنالے۔ عمل صالح کا مطلب ہے کہ اپنی زندگی کو ان اخلاقی تقاضوں کے مطابق ڈھالنا جو خالق ومخلوق کے حوالے سے ہم پر عائد کیے گئے ہیں۔ پھر یہ سارے اسی طرح کرنے ہیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا اور چاہا۔ آپ سے ہٹ کر کوئی راستہ کسی صورت قابل قبول نہیں ہے۔

یہ ظاہر ہے ایک مشکل کام ہے۔ یہ نفس وشیطان کے خلاف لڑنا ہے۔ یہ خواہش اور جذبات سے جنگ کے مترادف ہے۔ اس لیے آج کے مسلمانوں نے اپنے لیے ایک دوسرا راستہ پسند کرلیا ہے۔ مگر وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ ایمان واخلاق کی لائی ہوئی آپ کی اصل دعوت کے اتباع اور اطاعت کے سوا نجات کا کوئی راستہ نہیں۔

روحانیت کی حقیقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر عظمت کے ان گنت تاج ہیں۔ ان میں سے ایک اس حقیقت سے دنیا کو روشناس کرانا ہے کہ روحانیت دراصل کس چیز کا نام ہے۔ سرکار دوعالم سے قبل روحانیت ترک دنیا کا نام تھا۔ یہ بیوی بچوں، گھر بار، مال و دولت اور تمام علائق دنیا کو چھوڑ کر کسی جنگل ویرانے میں جا بیٹھنے اور اللہ اللہ کرنے کا نام تھا۔ ہندو، بدھ، مسیح اور یہود سب ہی کے نزدیک یہی روحانیت اور مذہب کا کمال تھا۔

ایسے میں عارف اعظم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ نے عورت کی اُس ہستی کو جسے دنیا کا سب سے بڑا فتنہ سمجھا جاتا ہے، اسے محبوب ترین متاع قرار دیا، (صحیح الجامع، رقم 3124)۔ اس سے بڑھ کر تعلق زوجین کے حوالے سے دعا سکھا کر آپ نے شہوت اور حیوانیت کو روحانیت کا جو قالب عطا کیا وہ کسی مذہبی انسان کے لیے ناقابل تصور ہے۔

اس کے برعکس رہبانیت کو دین اسلام میں بدعت قرار دیا گیا اور بدعت کو مذہبی اعتبار سے بدترین چیز قرار دیا گیا۔ رہبانیت اور بدعت دونوں آخری درجے کے مذہبی اعمال ہیں جن میں دنیا کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ یہ اللہ کی مرضی کے خلاف ہیں اس لیے روحانیت کے قالب میں ایک ضلالت ہیں۔ یہی وہ اصل فرق ہے جسے آپ نے اپنی تعلیمات میں واضح کر دیا۔

جب کوئی عمل اللہ کی مرضی کے مطابق کیا جاتا ہے تو وہ عین روحانیت ہے چاہے بظاہر دیکھنے میں وہ حیوانیت نظر آ رہا ہو۔ مگر جب اللہ کی مرضی اور پسند سے آگے بڑھ کر اپنی مرضی سے کچھ کیا جائے تو چاہے وہ عمل عین عبادت ہو، اللہ کی بارگاہ میں ضلالت قرار پاتا ہے۔

یہی اسلام کا حقیقی تصور روحانیت ہے۔ یہ تصورِ روحانیت اللہ کی مرضی کے رنگ میں رنگ جانے کا نام ہے۔ اس کی اصل اپنی خواہش اور مرضی کو فنا کر کے خدا کی رضا کو زندگی بنانا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر حیوانیت سے بھی روحانیت پھوٹتی ہے اور ایسا نہیں تو عبادت بھی ضلالت قرار پاتی ہے۔

غلبے کا خواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت خدیجہؓ سے شادی کے وقت آپ کے چچا ابو طالب نے ایک خطبہ دیا۔ جس میں آپ کے متعلق فصیح و بلیغ عربی میں ارشاد فرمایا:

''محمد ابن عبداللہ جو میرے بھتیجے ہیں قریش کے ہر نوجوان سے نیکی، فضل، کرم، عقل، احترام اور شرف میں برتر ہیں۔ گرچہ ان کے پاس مال کم ہے مگر مال تو ڈھلنے والا سایہ ہے۔''

یہ نبی کریم کی جوانی پر گھر کی گواہی تھی اور جب آپ کے پاس مال و دولت بہت ہو چکا تھا اس وقت آپ کی اہلیہ محترمہ اماں خدیجہؓ نے پہلی وحی کے موقع پر آپ کے کردار کو یوں بیان کیا:

''اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے، کمزور کا بوجھ اٹھاتے محتاج کو کما کر دیتے، مہمان نوازی کرتے، مشکل وقت میں حق کا ساتھ دیتے ہیں۔''، (بخاری، رقم 3)

مسلمانوں کا شاید سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ اور آپ کا عشق دونوں کمال درجے میں موجود ہے، نہیں ہے تو آپ کی سیرت و کردار کا وہ نمونہ نہیں ہے جس کی شہادت آپ کے چچا اور آپ کی اہلیہ نے دی تھی۔

یہ سیرت و کردار کتنی بڑی چیز تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ آغاز نبوت میں آپ نے اسے اپنی سچائی کی سب سے بڑی دلیل کے طور پر پیش کیا تھا۔ نبوت کے اعلان عام کے موقع پر آپ نے کوہ صفا پر چڑھ کر سارے قریش کو پکارا اور ان سے پوچھا کہ اگر میں کہوں کہ پہاڑ کے دوسری طرف ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو کیا تم مان لو گے۔ سب نے کہا کہ ضرور مانیں گے کیونکہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ یہی وہ لوگ تھے جو تمام تر مخالفت کے باوجود ہجرت کے وقت تک اپنی ساری امانتیں نبی کریم کے پاس رکھا کرتے تھے۔

کردار، اخلاق، صدق و امانت پر مبنی یہی وہ سیرت تھی جس نے اسلام کو دنیا میں غالب کیا۔ آج اس سیرت کے بغیر کسی غلبے کا خواب دیکھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

نبی کریم کی سچائی کا ایک ثبوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ہر موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آپ اترتی تھی۔ یہ وحی جو قرآن کریم کی صورت میں آج دنیا کے سامنے موجود ہے، ایک عجیب وغریب طریقے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کا ایک زندہ ثبوت بھی ہے۔

قرآن مجید؛ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور اس راہ میں پیش آنے والے مختلف مراحل اور اہم واقعات کا ریکارڈ ہے۔لیکن حیرت انگیز طور پر یہ کلام آپ کے ذاتی احساسات اور تاثرات سے مکمل طور پر خالی ہے۔ دنیا کا کوئی مصنف اور داعی اس پر قدرت نہیں رکھتا کہ 23 برس پبلک میں کھڑے ہوکر کلام کرے اور ہر طرح کے حالات کے باوجود اس کی دعوت اس کے ذاتی تاثرات اور احساسات سے بالکل خالی رہے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھیے ۔ مدینہ میں ایک موقع پر منافقین نے آپ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہؓ پر بہتان لگایا۔کوئی آدمی چاہے عام ہو یا خاص اس کے لیے ایسے بے ہودہ اور جھوٹے الزام پر اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ سیرت کے ریکارڈ کے مطابق اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اضطراب کا شکار ہو گئے تھے۔مگر جب قرآن مجید نازل ہوا تو وہ ان احساسات وتاثرات سے بالکل خالی ہے جو کسی ایسی ہستی کے ہو سکتے ہیں جس کی محبوب بیوی پر بہتان لگایا گیا ہو اور وہ اس علاقے کا صاحب اقتدار حکمران ہو۔

اس واقعے کی پوری تفصیلات سیرت کی کتابوں اور سیدہ عائشہ کی براءت میں اترنے والی آیات (النور 11:24 تا 26) آج تک موجود ہیں۔آپ کو سیرت کی کتابوں میں اس پاکدامن خاتون کے شوہر کا اضطراب دکھائی دے گا جس پر بہتان لگایا گیا اور قرآن میں پروردگار عالم کلام کرتا دکھائی دے گا جس کی کوئی بیوی نہیں اور جو کسی طرح کے حالات سے متاثر نہیں ہوتا۔یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور سچائی کا اہم ترین ثبوت ہے۔

آخری معجزہ

محمد ابن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم 571 عیسوی میں پیدا ہوئے۔ چالیس برس کی عمر میں آپ نے اعلان نبوت کیا۔ آپ کی دعوت کا خلاصہ یہ تھا کہ لوگوں غیر اللہ کی پرستش چھوڑ کر ایک اللہ پر ایمان لے آؤ جس کے حضور تمھیں ایک روز پیش ہونا ہے۔ اس روز جو ایمان اور اچھے اعمال کا سرمایہ ساتھ لایا جنت کی ابدی بادشاہی اس کا مقدر بنادی جائے گی۔ جو نافرمانی اور گناہ ساتھ لایا اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگی۔ یہی آپ کی اصل دعوت تھی۔ مگر ساتھ ہی آپ نے اپنے مخاطبین کو واضح طور پر یہ بتادیا تھا کہ ایمان لانے والوں کو نہ صرف عرب بلکہ متمدن دنیا کا اقتدار بھی دے دیا جائے گا اور منکرین کی جڑ ان کی اپنی زمین یعنی مکہ اور عرب سے بھی کاٹ دی جائے گی۔

13 برس تک آپ مکہ میں یہی دعوت دیتے رہے۔ جب بات واضح ہوگئی تو اللہ کے حکم سے آپ نے مدینہ ہجرت کی۔ جس کے بعد وہ نتائج نکلنے شروع ہوگئے جن کی آپ نے خبر دی تھی۔ دو ہجری میں میدان بدر میں آپ کے دشمن تمام اہم سرداران مکہ قتل کر دیے گئے۔ آٹھ ہجری میں مکہ فتح ہوگیا اور 11 ہجری 632 عیسوی میں جب آپ رخصت ہوئے تو سرزمین عرب پر ایک بھی مشرک نہ رہا تھا اور کل عرب پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔

اس کے بعد آپ پر ایمان لانے والوں کا زمانہ شروع ہوا اور حضرت عثمان کے زمانے میں سن 650 عیسوی تک موجودہ پاکستان سے لے کر شمالی افریقہ اور وسط ایشیا میں بحیرہ کیسپین سے لے کر بحیرہ روم کے دور دراز جزائز یعنی قبرض اور رہوڈز (Rhodes) تک پوری دنیا مسلمانوں کے قبضے میں تھی۔ اس عرصہ میں عظیم ترین سپر پاور ساسانی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور عظیم رومی سلطنت ایشیا اور افریقہ سے شکست کھا کر بے دخل ہو چکی تھی۔

جنگ بدر یعنی 623 سے فتح رہوڈز 648 عیسوی تک اس عرصہ میں مسلمانوں کا عالم عرب و

عجم پر یہ غلبہ نہ صرف انتہائی تیز رفتار ہے جس کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی بلکہ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ حریفوں کے مقابلے پر کمزور رہے، مگر فتح حاصل کی۔ تاہم جب اللہ کے رسول کی نافرمانی کی تو جنگ میں فتحیاب ہونے اور تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مثلاً احد میں مسلمان جنگ جیت رہے تھے، مگر جب پہاڑ پر متعین دستے نے اپنی جگہ چھوڑی تو جیتی ہوئی بازی ہاردی۔ حنین میں مسلمان تیرہ ہزار تھے، مگر پھر ہوازن کے تیر اندازوں نے ان کے قدم اکھاڑ دیے۔

تاہم بدر میں تین گناہ زیادہ دشمن کو شکست دی۔ جنگ خندق میں مدینے کی کل آبادی سے زیادہ بڑی فوج کو نامراد لوٹایا۔ رسول اللہ کی پکار پر لبیک کہا تو حنین میں ہاری ہوئی جنگ کا نقشہ پلٹ گیا۔ آپ کے بعد پورا عرب جھوٹے نبیوں، منکرین زکوٰۃ اور مرتدین کی زد میں تھا مگر مسلمانوں نے ان سب کو شکست دی۔ پھر بیک وقت دنیا کی دو عظیم سپر پاورز سے جنگ شروع کی۔ ایران کے ساتھ قادسیہ کی فیصلہ کن جنگ میں دولاکھ ایرانیوں اور روم کے ساتھ یرموک کی فیصلہ کن جنگ میں چار لاکھ رومیوں کے مقابلے میں تیس چالیس ہزار مسلمان تھے۔ مگر ہر دفعہ فتح ان کا مقدر رہی۔

اس ساری تفصیل کا مقصد اس بات کو واضح کرنا ہے کہ مسلمانوں کا یہ غلبہ جس کا وعدہ اللہ نے ان سے کیا تھا، بے شک ایک عظیم معجزہ تھا۔ اللہ نے ہر پیغمبر کو معجزے عطا کیے ہیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرآن مجید ہے جو کئی پہلوؤں سے معجزہ ہے۔ اس معجزہ میں یہ خبر بہت پہلے دے دی گئی تھی کہ کفار مکہ کی جڑ کاٹ دی جائے گی اور سارے عرب میں کل دین اللہ کے لیے ہو جائے گا۔ ایمان والے زمین کے حکمران بنادیے جائیں گے۔ یہ وعدے پورے ہو گئے۔ تاکہ دنیا جان لے کہ جو وعدے نبی اخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کے بارے میں کیے گئے ہیں وہ بھی ایسے ہی پورے کیے جائیں گے۔

ختم نبوت کا تقاضہ

مسلمانوں کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نبوت ورسالت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔اس عقیدے کو ماننے کا لازمی مطلب ہے کہ کسی نئے نبی اور رسول پر ایمان نہیں لایا جاسکتا۔اس بات سے سارے مسلمان واقف ہیں۔مگر اس عقیدے کو ماننے کا ایک اور لازمی تقاضہ ہے جس سے حیرت انگیز طور پر سارے مسلمان ناواقف محسوس ہوتے ہیں۔وہ تقاضہ ہے کہ ایمان کی دعوت کو انسانیت تک پہنچانا۔

ایک نبی کا بنیادی کام ایمان کی دعوت دینا ہے۔یہی دعوت روز ازل سے انسانوں کی فطرت میں ودیعت کردی گئی ہے،مگر شیطان فطرت کی اس راہ پر بیٹھ کر انسانوں کو گمراہ کرتا رہتا ہے۔یوں انسانیت ہر دور میں توحید سے دور ہوتی رہی ہے۔یہاں تک کہ ایک اللہ کا نام لینا جرم بن گیا جس کی قیمت اپنی جان کی شکل میں دینی پڑتی۔نبی اسی مشکل ترین چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجے گئے کیونکہ اس بدترین صورتحال سے نمٹنا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ تاہم نبیوں کے آنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ان کا کفر خدا کے غضب کا باعث بن جاتا تھا۔

ایسے میں اللہ کی رحمت نے اپنے محبوب نبی کو آخری نبی اور رحمت للعالمین بنا کر بھیجا۔آپ کے ذریعے سے مذہبی تعذیب کا وہ دور ختم ہوا جس میں کسی شخص کو اس کے مذہبی نقطہ نظر کی بنا پر قتل کر دیا جاتا تھا۔اب آزادی کا وہ دور شروع ہوا جب ہر شخص کو اپنی مرضی کا عقیدہ رکھنے کی آزادی حاصل ہوگئی۔انسانوں کے امتحان کی وہ فطری فضا پیدا ہوگئی جو اصل میں مطلوب تھی۔اب نہ دین کی دعوت دینا کسی مصیبت اور عذاب کا سبب رہا نہ کسی دین کو قبول کرنا اپنی جان مال آبرو کو برباد کرنے کے مترادف رہا۔چنانچہ نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

اس کے ساتھ مزید یہ اہتمام کیا گیا کہ نبی کی نام لیوا ایک امت وسط قائم کر دی گئی اور

اسے باقاعدہ یہ ذمہ داری دی گئی کہ جس طرح رسول نے ان پر حق کی شہادت دی ہے وہ لوگوں پر حق کی شہادت دیتے رہیں۔ صحابہ کرام نے اس ذمہ داری کو پوری طرح سمجھا اور اپنے زمانے کی متمدن دنیا کو اسلام سے روشناس کرایا۔ چنانچہ ان تمام علاقوں میں جہاں صحابہ کرام پہنچے اسلام کی دعوت نے لوگوں کو مسخر کیا۔ حتیٰ کہ لوگوں نے اپنی تہذیب اور زبان تک چھوڑ کر ان کے رنگ میں رنگ گئے۔

بدقسمتی سے اگلی نسلوں کے مسلمان ''امت وسط''یعنی نبی اور انسانیت کے بیچ کی امت بنے کے بجائے ایک قوم بن گئے۔ آنے والے برسوں میں اس قوم نے ہندوستان، اسپین اور مشرقی یورپ میں سیاسی اقتدار قائم کیا، مگر اسلام کی دعوت پہنچانے میں دلچسپی نہ لی۔ نتیجہ یہ نکلا ان تمام مقامات کا اقتدار بھی ان کے ہاتھ سے گیا۔ اسی غفلت کے نتیجے میں کبھی تاتاریوں کا عذاب ان پر مسلط ہوا تو کبھی صلیبیوں کی یلغار نے انہیں امن سے محروم رکھا۔ مگر جب کبھی مسلمانوں نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے دعوت کا کام کیا تو وحشی تاتاری اسلام کے محافظ بن گئے اور دنیا کے بڑے بڑے خطے بغیر جنگ کے مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ اس وقت بھی دنیا کے تین سب سے بڑے مسلم ممالک وہ ہیں جہاں دعوتی عمل کے نتیجے میں اسلام آیا اور آج تک وہاں مسلمانوں کا اقتدار قائم ہے۔

بدقسمتی سے آج کے مسلمان دعوت کو چھوڑ کر سیاسی جنگوں میں الجھ چکے ہیں۔ وہ تاریخ کے اس واضح سبق سے بالکل جاہل دکھائی دیتے ہیں کہ سیاسی اقتدار کو شکست ہو جاتی ہے اور اندلس، مشرقی یورپ اور ہندوستان کا اقتدار ہاتھ سے چلا جاتا ہے، مگر دعوتی جدوجہد سے جو اقتدار قائم ہوتا ہے سیاسی شکست کے بعد بھی کبھی ہاتھ سے نہیں جاتا۔ مگر ان سب سے بڑھ کر دعوتی کام ختم نبوت کو ماننے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس شعور کے بغیر ختم نبوت پر حقیقی ایمان ممکن نہیں۔

سرکار کے ساتھی

انسانی شخصیت چار چیزوں سے مل کر تشکیل پاتی ہے۔ فطرت میں موجود خیر و شر کے داعیات، وراثت میں ملا ہوا مزاج اور رجحانات، ماحول اور حالات کے اثرات اور تعلیم و تربیت کے ثمرات۔ یہ چاروں چیزیں وہ ہیں جو انسان کے شعوری زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے ہی اپنا اثر دکھا چکی ہوتی ہیں۔ فطرت اور وراثت تو پیدائشی ہوتی ہے جبکہ ماحول گھر اور خاندان وغیرہ بچپن اور تعلیم و تربیت لڑکپن میں مل چکی ہوتی ہے۔ اس کے بعد کم و بیش پندرہ برس کی عمر تک جب انسان شعوری زندگی کا آغاز کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر اس کی شکل و صورت کی طرح اس کی شخصیت اور نفسیات کی صورت گری بھی اس سے پوچھے بغیر کر چکی ہے۔

یہ بظاہر زیادتی ہے۔ مگر درحقیقت یہ امتحان ہے جس میں انسان کا اصل ہتھیار عقل و شعور اور ارادے کی وہ طاقت ہے جس کو استعمال کر کے انسان اپنی شخصیت کی جس طرح چاہے تشکیل نو کر لے۔ عقل اور ارادہ انسان کی وہ صلاحیت ہے جس کی مدد سے انسان نے زمین و آسمان کو اپنی مرضی کے تابع کر لیا ہے۔ ان کی مدد سے انسان خلا میں سفر کرتا، بادلوں سے اونچا اڑتا، سمندر کا سینہ چیرتا، زیر آب تیرتا اور زمین پر کسی بھی حیوان سے زیادہ تیز چل سکتا ہے۔

انسان چاہے تو یہی عقل اور ارادہ استعمال کر کے وہ اپنی فطرت میں دبے خیر کو اتنا طاقتور بنا سکتا ہے کہ وراثت، جبلت، ماحول، حالات اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے ہر برے اثر کو قابو میں لا سکتا ہے۔ عقل و ارادے کی بنیاد پر اپنی شخصیت، نفسیات، ترجیحات، تعصّبات اور پسند و ناپسند کو مکمل طور پر تبدیل کر کے ان پر قابو پانے کی بہترین مثال صحابہ کرام کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایک ایسے معاشرے میں ہوئی جو پورے عرب میں شرک کا مرکز تھا۔ اللہ کا گھر سیکڑوں بتوں پر مشتمل ایک مندر بنا ہوا تھا اور یہ بت لوگوں کی تمام تر

عقیدت و محبت کا سر چشمہ تھے۔ صدیوں اور قرنوں سے جنگ و جدل کی وراثت پانے کے بعد یہ قوم ایک جھگڑالو قوم تھی جسے لڑنے کے لیے کوئی نہ ملتا تو اپنی ہی بھائیوں بندوں سے نبرد آزما ہو جاتی تھی۔ ماحول اور وراثت کے اس مجموعے کو شاعری اور خطابت کی تعلیم اور تربیت نے ان لوگوں کا فخر بنا دیا تھا۔ دور قدیم میں شرک تو سب کیا کرتے تھے، لیکن یہ لوگ فخر سے شرک کو اپنا دین کہتے تھے۔ جنگ و جدل دنیا کی ہر قوم میں ہوتا تھا، مگر یہ وہ قوم تھی کہ جنگ جس کی معیشت اور معاشرت بن چکی تھی۔

ایسے میں سرکار دو عالم کی پاکیزہ فطرت ہستی نے توحید کی صدا بلند کی۔ عقل اور فطرت کی ہر دلیل دے کر لوگوں کو سمجھایا کہ تنہا ایک ہی رب عبادت کے قابل ہے اور ایک روز اس کے حضور پیش ہو کر سب کو اپنے عمل کا جواب دینا ہے۔ نور نبوت کے آفتاب ہدایت کی روشنی کو جس جس نے قبول کیا، اس کی زندگی بدلتی چلی گئی۔ زندگی ہی نہیں شخصیت اور نفسیات تک بدل گئی۔

جو بتوں کے غلام تھے نشہ توحید سے سرشار ہو گئے۔ جو شرابوں کے رسیا تھے وہ گرم ترین موسم میں پانی کو ترک کرنے والے روزہ دار بن گئے۔ جنگ و جدل، لوٹ مار اور نسوانی حسن جن کی شاعری کا موضوع تھا ان کے درمیان سے ایک عورت سونا اچھالتی پورا عرب طے کر کے گزر جاتی تھی مگر کوئی اسے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔

شدید غصے کے مالک اور سگی بہن پر ہاتھ اٹھانے والے عمر دنیا کے بادشاہ بن گئے مگر حال یہ تھا کہ ایک عورت سر بازار انہیں نصیحت کرتی اور وہ سر جھکا کر سنتے۔ احد کے دن رسول اللہ کی تلوار سے دشمنوں کی صفیں چیرنے والے ابو دجانہ کو خود پر اتنا قابو تھا کہ جب ایک عورت سامنے آئی تو تلوار اس کے سر پر پہنچ کر رک گئی۔ صحابہ کرام بلاشبہ دنیا میں اس ماڈل کی سب سے بڑی مثال ہیں کہ کس طرح عقل اور ارادہ انسان کی نفسیات اور شخصیت بدل کر اسے کچھ سے کچھ بنا سکتا ہے۔ چاہے اس کی وراثت، تربیت اور ماحول کا سبق جو بھی ہو۔

سرکار کے دشمن

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی داعیانہ زندگی میں دو گروہوں کی طرف سے سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ایک کفار مکہ اور دوسرے یہود مدینہ۔ یہ دونوں اپنے اپنے اعتبار سے مذہبی لیڈر تھے۔ کفار مکہ قریش کی وہ قیادت تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد اور مشرکین عرب کے سردار حرم کے نگہبان تھے۔مگر عرصہ ہوا بت پرستی کو اپنا شعار بنا چکے تھے۔ جبکہ یہود حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں سے تھے جنھیں امامت عالم کا فریضہ دیا گیا، مگر وہ اپنی نافرمانیوں کے سبب اللہ کے غضب کا شکار ہو چکے تھے۔

یہ دونوں گروہ بظاہر دین کے نام پر کھڑے تھے، مگر یہ دین کو اپنے مفادات کا کاروبار اور اپنے تعصّبات کا سہارا بنا چکے تھے اور ان کی اصل انھی کے ساتھ تھی۔ چنانچہ انھوں نے سچائی کی مخالفت کا بھرپور فیصلہ کرلیا۔اس مخالفت کی بنیاد ظاہر ہے کہ علم و عقل کی کوئی دلیل نہ تھی۔ ان کا واحد ہتھیار ان کے منفی ہتھکنڈے تھے۔ ان ہتھکنڈوں میں بے معنی اعتراضات، فروعی موشگافیاں، غیر متعلق نکتہ آفرینیاں، بے بنیاد اور جھوٹا پروپیگنڈا، الزام و بہتان، ظلم و تشدد بہت نمایاں تھا۔مگر آخر کار ان کو شکست ہوئی اور دین اسلام کی سچائی غالب ہوگئی۔

بدقسمتی سے یہی ہتھیار ہر دور میں سچائی کے خلاف کھڑے ہونے والوں کا سب سے بڑا سرمایہ رہے ہیں۔ جب کوئی سچی دعوت اٹھتی ہے تو دین کے نام پر اپنی دوکانداری چمکانے والے لوگ اس کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ سچائی ان کے کاروبار کو ماند کر دے گی۔ چنانچہ جھوٹ، اعتراضات، بہتان اور ظلم کی تلوار لے کر وہ کھڑے ہو جاتے ہیں مگر زبان سے حق کا نام لیتے ہیں۔مگر ان سب کا انجام آخر کار وہی ہوتا ہے جو سرکار کے دشمنوں کا ہوا تھا۔ دنیا اور آخرت کی ذلت کے سوا ان کے حصے میں کچھ نہیں آتا۔

نبی کا جنازہ اور صحابۂ کرام

پچھلے دنوں میرے پاس ایک نوجوان کا یہ سوال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت ایسا کیوں ہوا کہ صحابہ کرام اور خاص کر حضرات ابوبکر وعمر، ان کی تجہیز و تکفین کی فکر کرنے کے بجائے خلافت حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ مسیحی نوجوان کا یہ سوال دراصل ایک پورا نقطۂ نظر ہے جو بہت سی غلط فہمیوں پر مشتمل ہے۔ سرسری معلومات کی بنا پر بہت سے لوگ اس نقطۂ نظر سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حقائق کی روشنی میں اس دعویٰ کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مسلمانوں کے اجتماعی نظام کے متعلق یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ان کے معاملات ان کے باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اور ان کا نظام باہمی مشورے پر مبنی ہے''، (شوریٰ 38:42)

قرآنِ پاک کا یہ حکم عرب کے اُس قبائلی معاشرہ میں اترا، جس میں کسی اجتماعی ریاست کا تصور تھا اور نہ کسی واحد حاکمِ اعلیٰ کی کوئی تاریخ ہی پائی جاتی تھی۔ اسلام سے قبل ہر قبیلے کا اپنا سردار ہوتا جو اس کے معاملات چلاتا تھا۔ عرب میں کوئی باقاعدہ ریاست تھی اور نہ اس کا کوئی مستقل حکمران تھا۔ حتیٰ کہ ام القریٰ مکہ کے مرکزی شہر میں بھی کوئی حکمران نہ تھا۔ وہاں بمشکل تمام ایک ڈھیلا ڈھالا نظمِ اجتماعی تھا جس میں قبائلی سردار کسی اجتماعی مسئلے پر اکٹھے ہو جاتے اور مل جل کر کوئی فیصلہ کر لیتے۔

ایسے میں اسلام کا ظہور ہوا۔ ہجرت کے بعد مدینہ کی ریاست وجود میں آئی۔ حضور نبی کریم فطری طور پر اس ریاست کے حکمران تھے۔ 8 ہجری تک یہ ریاست صرف مدینہ اور اس کے اطراف تک محدود تھی۔ پھر فتحِ مکہ کے بعد صرف تین برس میں یہ ریاست پورے عرب میں پھیل

گئی۔ یہ وہ عرب تھا جہاں انتشار و اختلاف کے شکار قبائل اور طرح طرح کی عصبیتیں موجود تھیں اور جو پہلی دفعہ کسی ایک حکمران کے ماتحت اکٹھا ہوا تھا۔ مگر لوگوں کا حضور پر بحیثیت رسول ایمان اور حضور کا سب سے برتر قبیلے یعنی قریش سے تعلق وہ چیز تھا جس نے عرب میں یہ سیاسی انقلاب برپا کر دیا۔ تاہم حقیقت یہ تھی کہ نئے ایمان لانے والے قبائل ابھی تک اس پورے نظام کے عادی نہیں ہوئے تھے۔

اپنے آخری وقت میں حضور کو اس صورتحال کا مکمل اندازہ تھا۔ مگر آپ نے اس حوالے سے کوئی بات اس لیے نہیں فرمائی کہ مسلمانوں کے پاس بہر حال اللہ تعالیٰ کا حکم موجود تھا۔ دوسرے حضور کو معلوم تھا کہ آپ نے اس موقع پر اگر لوگوں کو کوئی حکم دے دیا تو وہ تا قیامت سورہ شوریٰ کی مذکورہ بالا آیت کی واحد قابل عمل شکل قرار پائے گی۔ یہ بات اُس وقت کے قبائلی دور کے حساب سے تو ٹھیک ہوتی، مگر آنے والے زمانوں میں حکمران کے انتخاب کے ہر دوسرے طریقے کو غیر اسلامی بنا کر، اسلام کے نا قابل عمل ہونے کا ایک نمایاں ثبوت بن جاتی۔ جبکہ اسلام کو قبائلی دور ہی کا نہیں بلکہ آج کے انفارمیشن دور کا مذہب بننا تھا۔ چنانچہ حضور کو جب اندازہ ہو گیا کہ رخصت کا وقت قریب ہے تو آپ نے اپنی وفات سے پانچ دن قبل مسجدِ نبوی میں آخری خطبہ دیا۔ اس خطبے میں آپ نے مسلمانوں کو آخری وصیتیں کیں، مگر سیاسی حکمرانی کے عملی طریقے کے بارے میں کوئی رہنمائی نہیں کی۔ البتہ اُس شخص کی طرف اشارہ کر دیا جو آپ کی نظر میں اس منصب کا سب سے بڑھ کر اہل تھا۔ چنانچہ اس موقع پر آپ نے دین اور اپنی رفاقت کے حوالے سے حضرت ابوبکر کی خدمات گنوائیں اور حکم دیا کہ مسجد نبوی میں ان کے دروازے کے سوا ہر دروازہ بند کر دیا جائے (متفق علیہ)۔ اگلے دن سے اپنی جگہ حضرت ابوبکر کو مسجد نبوی کی امامت سونپ کر اپنا منشا لوگوں پر مزید واضح کر دیا (متفق علیہ)۔

چار دن بعد پیر کے دن ظہر سے قبل حضور کا انتقال ہو گیا۔ مسلمانوں پر اپنے محبوب نبی کے رخصت ہونے کا انتہائی شدید صدمہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ دوسری تلخ حقیقت یہ تھی کہ قبائلی عصبیت سے بھرپور عرب کی نئی ریاست میں حکمرانی کا منصب خالی ہو چکا تھا اور کسی جانشین کا ابھی تک تعین نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ وہی ہوا جو اس پس منظر میں متوقع تھا۔ انصار کے بعض لوگ سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھا ہو کر حضور کی جانشینی کے مسئلے پر گفتگو کرنے لگے۔ حضرت ابوبکر جو بلا شک وشبہ اس وقت مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر تھے، ان سے اس موقع پر اگر معمولی سی بھی کوتاہی ہو جاتی تو اسلام کی تاریخ بننے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔ ان حالات میں حضرت ابوبکر حضور کے انتقال کی خبر سن کر سیدھے مسجد نبوی تشریف لائے اور ان شاندار الفاظ سے مسلمانوں کا حوصلہ بلند کیا کہ ''جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے تو وہ جان لے کہ اللہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے کبھی نہیں مرے گا''، (بخاری 640/2641)۔ اس کے ساتھ ان پر یہ ذمہ داری بھی آن پڑی کہ وہ مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔ چنانچہ وہ حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح جیسے اہم قریشی سرداروں کو لے کر انصار کے ہاں گئے اور ایک طویل بحث و گفتگو کے بعد حضور کے بعض ارشادات کی روشنی میں انصار کو اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ خلیفہ قریش میں سے ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ہر شخص کو معلوم تھا کہ قریشی مسلمانوں میں سب سے بڑا لیڈر کون ہے۔ چنانچہ حضرت عمر نے ان کا نام تجویز کیا جسے سب نے فوراً تسلیم کر لیا۔ یوں ریاستِ مدینہ میں انتشار کا خطرہ ٹل گیا۔ مگر اس پورے عمل میں پیر کے دن کی رات ہو گئی۔ اگلے دن منگل کو حضور کو سیدنا علی اور دیگر قریبی اعزا نے غسل دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسبِ ارشاد آپ کی قبر آپ کی وفات کی جگہ پر ہی بنائی جانی تھی۔ اس لیے تدفین اور نمازِ جنازہ کے لیے کہیں اور جانے کا سوال نہیں

تھا۔اس لیے لوگوں نے گروہ در گروہ آ کر سیدہ عائشہ کے اس حجرے ہی میں نماز ادا کی جہاں آپ کا انتقال ہوا تھا۔اس عمل میں منگل کا پورا دن گزر گیا اور بدھ کی رات کے درمیانی اوقات میں حضرت عائشہ کے حجرے میں حضور کی تدفین عمل میں آئی۔

یہ ہے وہ بات جس کا افسانہ بنا کر ہمارے بعض مسلمان بھائی اسلام، اس کے نبی اور ان کے بہترین پیروکاروں کے بارے میں ایسے سوالات پیدا کر دیتے ہیں جن کی بنا پر نئی نسل اسلام سے بدظن ہو جاتی ہے اور غیر مسلموں کو ہمارا مذاق اڑانے کا موقع مل جاتا ہے۔جبکہ ہر صاحب علم یہ بات جانتا ہے کہ حضرت ابوبکر کے ابتدائی زمانے میں خلافت کے قیام اور مہاجرین و انصار اور قریشِ مکہ کی بھرپور تائید کے باوجود عرب میں ایک زبردست بغاوت رونما ہوئی۔اندازہ کیجیے کہ اگر حضور کے انتقال کے وقت حضرت ابوبکر اور حضرت عمر فوری فیصلہ کر کے نزاع کو ابتدا ہی میں ختم نہ کرتے اور اہل مدینہ میں باہمی انتشار پیدا ہو جاتا تو مسلمانوں کا کیا انجام ہوتا؟

ہم نے جو کچھ تحریر کیا ہے، اس کی تائید سیدنا علی کے اپنے طرز عمل سے ہوتی ہے۔صورتحال کی سنگینی کا اندازہ نہ ہونے کی بنا پر انھیں ابتدا میں یہ شکایت تھی کہ مجھے مشورے میں کیوں شریک نہیں کیا گیا، مگر جب ان پر معاملہ واضح ہو گیا تو انھوں نے سیدنا ابوبکر کی بیعت میں تاخیر نہیں کی۔پھر اس کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے پورے دورِ حکومت میں انھوں نے بھرپور طریقے سے ان حضرات کی معاونت کی اور ہمیشہ ان کے قریب ترین مشیر رہے۔ اور ان دونوں نے بھی ہر معاملے میں حضرت علی کی رائے کو مقدم رکھا۔

بلاشبہ صحابہ کرام وہ لوگ ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا حق اس طرح ادا کیا کہ قرآنِ مجید نے بھی جگہ جگہ ان کے اخلاص اور قربانی کی گواہی دی ہے۔قرآنِ کریم کی اس گواہی کے بعد ان لوگوں کی صداقت کے لیے کسی اور گواہی کی ضرورت نہیں۔

نرم گدا اور گرم صحرا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے بعد آپ پر زیادہ تر نوجوان اور کمزور طبقات کے لوگ ایمان لائے۔ جبکہ سرداران قریش نے آپ کی دعوت کو رد کردیا۔ جب دعوت پھیلنے لگی تو ان سرداروں کو اندیشہ ہوا کہ یہ نیا مذہب ان کی طاقت کو مکمل طور پر ختم نہ کرڈالے۔ چنانچہ ابتدا میں انہوں نے مسلمانوں کو زبانی کلامی سمجھانے کی کوشش شروع کی۔ اس میں ناکامی کے بعد انھوں نے مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے شروع کردیے۔

اس ظلم کا سب سے بڑا نشانہ وہ غلام اور کنیز بنے جن کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ان میں بلال، یاسر، صہیب، خباب، عمار، سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین کے نام نمایاں ہیں۔انھیں بری طرح مارا پیٹا جاتا، گلیوں میں گھسیٹا جاتا، بھوکا پیاسا قید کیا جاتا، جلتے لوہے سے داغا جاتا اور صحرا کی تپتی دوپہر میں زمین پر ننگے بدن لٹا کر اوپر گرم پتھر رکھ دیے جاتے۔مگر وہ لوگ دین پر قائم رہے۔

ہم لوگ اس طرح کی باتیں جب لکھتے یا پڑھتے ہیں تو ٹھنڈے کمرے، گرم لحاف، نرم گدے میں بیٹھے ہوتے ہیں۔اسے کوئی کہانی سمجھ کر سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ہمیں نہیں احساس کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور ان کے اصحاب کی بے پناہ قربانیوں کی وجہ سے ہمیں ہمیشہ کے لیے اس صورتحال سے نجات دلا دی ہے۔ہمیں یہ احساس ہوجائے تو ہم پروردگار کے لیے سراپا شکر، نبی رحمت علیہ السلام اور ان کے صحابہ کے لیے سراپا درود بن جائیں۔

مگر ہم نرم گدے اور گرم لحاف میں سوتے ہیں اور فجر میں اٹھنا بھول جاتے ہیں۔ پیٹ بھر کھاتے ہیں اور نماز چھوڑ دیتے ہیں۔کاروبار اور تفریح میں ہمیں اللہ کی یاد نہیں رہتی۔ جتنا کچھ ہمارا اسلام ہے وہ ذہنی عیاشی، زبانی جمع خرچ، روحانی انٹرٹینمنٹ کے سوا کچھ نہیں۔کاش ہمیں یہ احساس ہوجائے کہ پچھلوں کی قربانیوں نے ہمارے لیے دین پر عمل کتنا آسان کردیا ہے۔ہمیں گرم صحرا میں ظلم سہہ کر نہیں نرم گدوں میں آسانی کے ساتھ دین پر عمل کرنا ہے۔

ابو یحییٰ

خالق و مخلوق کے عارف

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے اخری نبی اور رسول تھے۔ آپ پر وحی کے ذریعے سے پیغام الٰہی اتارا جاتا اور پھر آپ اپنی زبان مبارک سے اسے انسانوں تک پہنچاتے۔ اس مقصد کے لیے ایک طرف آپ خدا اور دوسری طرف انسانوں سے پوری طرح متعلق تھے۔

خالق و مخلوق سے آپ کا یہ تعلق محض رسمی نہیں تھا بلکہ آپ کی سیرت کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ جس طرح آپ خدا کو جانتے تھے کوئی نہیں جانتا تھا اور جس طرح مخلوق کو سمجھتے تھے، کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ آپ بلا شبہ اس دنیا میں خالق و مخلوق کے سب سے بڑے عارف تھے۔ اس کا اندازہ سیرت طیبہ کے دو واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک مکی زندگی کا واقعہ ہے اور دوسرا مدنی زندگی کا۔ اس ماہ کے رسالے میں میرے تمام مضامین چونکہ سیرت طیبہ کے حوالے سے ہیں اس لیے آج اس کالم میں بھی میں اسی حوالے کچھ گفتگو کروں گا۔

مکی زندگی کا واقعہ

مکہ مکرمہ میں اعلان نبوت کے بعد آپ کو قریش مکہ کی طرف سے زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ عام لوگ گرچہ ایمان لاتے رہے، مگر سرداروں میں سے کوئی ایمان نہیں لایا۔ ابتدا میں انہوں نے کچھ ہلکی مخالفت کی۔ مگر پھر اسلام کے اس سیلاب کا راستہ روکنے کے لیے انہوں نے ایمان لانے والوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ چنانچہ مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنا پڑی۔ جو مسلمان مکہ میں بچے انھیں قریش کے بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ نوبت فاقوں تک آ گئی۔ کئی برس آپ کو اسی ظلم و ستم کو سہتے اور بدترین حالات میں دعوت کا کام کرتے ہوئے گزر گئے۔ یہاں تک

کہ دس نبوی میں آپ کا تحفظ کرتے رہنے والے جناب ابوطالب اور آپ کی مونس وغمگسار محبوب رفیقہ حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوگیا۔ابوطالب کے بعد ابولہب قبیلہ کا سربراہ بنا اور آپ کو اس قبائلی حمایت سے محروم کردیا جس کے خوف سے کفار مکہ نے آپ کو ابھی تک براہ راست کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی وہ واقعات پیش آئے جس میں کفار نے آپ کے سر پر مٹی یا اوجڑی ڈالی اور دیگر ایسی تکالیف پہنچانی شروع کیں جو ابھی تک نہیں دی تھیں،(ابن ہشام)۔

سفر طائف

ان حالات میں آپ نے ایک آخری چارے کے طور پر طائف جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ مکہ سے سو کلومیٹر دور ایک بلند پہاڑی مقام یا ہل اسٹیشن (6165 فٹ) تھا جہاں مکہ کے سردار گرمیاں گزارا کرتے تھے۔آپ یہ طویل فاصلہ پیدل طے کرکے اس امید پر طائف پہنچے کہ یہاں کے سرداروں میں سے کوئی ایمان لے آیا تو اس کے اثر سے قریش بھی ایمان لے آئیں گے یا پھر ان کے شر سے مسلمانوں کو کچھ تحفظ مل جائے گا۔اس سفر میں حضرت زید بن حارثہ بھی آپ کے ساتھ تھے۔آپ نے یہاں آباد قبیلہ بنوثقیف کے تین سرداروں سے مل کر انھیں دعوت اسلام دی۔مگر انھوں نے توہین آمیز جواب دے کر آپ کی دعوت کو رد کردیا۔

آپ نے یہاں دس دن قیام کرکے کم وبیش ہر اہم سردار کو دعوت دی، مگر طائف کے ان پتھروں پر کوئی جونک نہ لگی۔ بلکہ یہ لوگ اپنی سنگدلی میں اہل مکہ سے بھی آگے بڑھ گئے۔انھوں نے شہر کے اوباشوں کو آپ کی اذیت رسانی کی مہم پر لگادیا۔ چنانچہ وہ تالیاں پیٹتے، سیٹیاں بجاتے، جملے کستے، گالیاں دیتے آپ کے ساتھ ساتھ چلتے جاتے۔ یہ تماشہ دیکھنے کو بھیڑ جمع ہوگئی۔اس پر شہہ پاکر ان بدبختوں نے رحمت للعالمین پر پتھروں کی برسات کردی۔حضرت زید

اپنے جسم کو ڈھال بنا کر آپ کو بچانے کی کوشش کرتے، مگر وہ کتنے پتھر روکتے۔ آپ لہولہان ہو گئے اور نعلین مبارک جسم سے بہتے خون سے بھر گئے۔ آخر کار طائف سے تین میل دور ایک باغ میں آپ نے پناہ لی تو ان اوباشوں سے جان چھوٹی۔

بے مثال دعا

یہی وہ وقت تھا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دعا مانگی جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ دعا کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''یا اللہ! میں تجھ ہی سے اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں میں اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے تو ہی ضعیفوں کا رب ہے اور میرا رب بھی تو ہی ہے۔ تو مجھے کن لوگوں کے حوالے کر رہا ہے۔ کسی بیگانے ترش رو کے یا کسی دشمن کے جس کے ہاتھ میں تو نے میرا معاملہ دے دیا ہے؟ اگر تجھ پر میرا غضب نہیں تو مجھے کوئی پروا نہیں۔ لیکن تیری عافیت میرے لیے کافی ہے۔ میں تیری ہستی کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تاریکیاں روشن ہو گئیں اور دنیا و آخرت کے معاملات درست ہوتے ہیں کہ مجھ پر تیرا غضب اترے یا تیری ناراضی مجھ پر آئے۔ تیری رضا ہی مطلوب ہے کہ یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے۔ اور تیرے سوا کوئی طاقت ہے نہ قوت۔''، (الجامع الصغیر، رقم:1483)

اس دعا کے الفاظ میں وہ تڑپ ہے جو کسی ترجمے یا تشریح میں بیان نہیں کی جا سکتا۔ اس میں ہر وہ اسلوب موجود ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اس میں شکویٰ ہے، مگر یہ شکویٰ اپنی ذات کے حوالے سے کوئی شکایت نہیں بلکہ اس کام کے حوالے سے ایک فریاد ہے جو اللہ ہی کا تھا اور اس کام کے کرنے والوں کی مدد کا اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے۔ اس میں اظہار عجز اور اضطرار ہے۔ مضطر کی فریاد کا جواب دینا اللہ نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ اس میں

امید ہے۔ اس ہستی سے امید ہے جس سے مایوسی کفر ہوتی ہے۔ اس میں سوال ہے۔ اس ہستی سے سوال ہے جس سے مانگنے والا کبھی محروم نہیں رہتا۔ اس میں دینے والے کی غیرت کو پکارا گیا ہے۔ اس میں تنہا صاحب اقتدار بادشاہ کے غضب سے عافیت اور پناہ کی درخواست ہے۔ اس میں توحید ہے۔ اس میں حمد ہے۔ اس میں تفویض ہے۔ اس میں توکل ہے۔ اس میں رضا ہے۔

غرض اس دعا میں ہر وہ چیز جمع ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندوں کے حال پر توجہ کرتے ہیں۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اس دعا میں دعا نہیں ہے۔ یعنی اس میں اللہ تعالیٰ سے براہ راست کچھ نہیں مانگا گیا ہے۔ اس دعا کو بار بار پڑھنے سے جو بات واضح ہوتی ہے کہ مانگنے والا اپنے تن، من دھن راہ خدا میں لگا چکا ہے۔ اک آخری سرمایہ عزت نفس کی شکل میں بچا تھا۔ وہ بھی آج طائف کے بازاروں میں خدا کے لیے لٹا دیا۔ مگر پھر غم دل سنانے کے بجائے صرف یہ فکر دامن گیر ہے کہ یہ خدا ناراض نہ ہو جائے۔ جسم ہے کہ خون سے لہولہان ہے۔ دل ہے کہ ٹوٹ کے کرچی کرچی ہو گیا ہے۔ مگر لبوں پر جب التجا آتی ہے تو نہ دشمن کے لیے بددعا ہوتی ہے نہ اپنے لیے کچھ مانگا جاتا ہے۔

تاریخ ساز دعا

مگر یہ دعا تاریخ کا رخ موڑ دیتی ہے۔ احادیث، سیرت اور تاریخ کا مطالعہ صاف بتاتا ہے کہ اس دعا کے بعد سب کچھ بدل دیا گیا۔ فوراً جبریل امین کو بھیجا گیا۔ ان کے ساتھ پہاڑوں پر مامور فرشتے بھیجا گیا کہ ان گستاخوں کو پہاڑوں کے بیچ میں کچل دیا جائے۔ یہ اپنے محبوب کی وہ تالیف قلب کی گئی جو کبھی کسی دوسرے رسول کی نہیں کی گئی کہ قوم کا فیصلہ رسول کے ہاتھ میں دے دیا۔ مگر رحمت للعالمین نے انھیں معاف کر دیا۔ پھر واپسی میں جنوں کی جماعت کو آپ کے پاس بھیجا اور پھر بتایا کہ یہ انسان تمھاری بات نہیں مانتے تو جن مان رہے ہیں۔ مکہ میں ابولہب کی جگہ

مطعم بن عدی نے آپ کو اپنی پناہ میں لے لیا اور اعلان کر دیا کہ کوئی آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ یہ تین کام تو اسی سفر سے واپسی پر کر دیے گئے۔

پھر اسی برس معراج واسریٰ کے واقعات میں مستقبل کا فیصلہ واضح طور پر سنا دیا گیا کہ بنی اسماعیل سے مکہ اور بنی اسرائیل سے بیت المقدس لے کر اب قیامت تک کے لیے تمھیں اور تمھارے نام لیواؤں کو امامت عالم دے دی جائے گی۔ یہ محض وعدہ نہ تھا بلکہ اِسی سال یثرب کے لوگوں نے اسلام قبول کیا جس کے بعد ہجرت مدینہ ہوئی اور آپ ایک بادشاہ کی حیثیت سے مدینہ میں داخل ہوئے اور چند ہی برسوں میں فتح مکہ کے بعد پورے عرب کے تنہا حکمران بن گئے۔ پھر ربع صدی کے اندر نبی اخراز ماں کو ماننے والے پوری متمدن دنیا کے حکمران بن گئے۔ اور پھر قیامت تک کے لیے کروڑوں اربوں لوگ پیدا ہوئے جو نبی کا نام سن کر سر عقیدت سے جھکا دیتے ہیں۔

کوئی شخص وہ لمحہ اگر متعین کرنا چاہیے جب یہ سب کچھ ظہور پذیر ہونا شروع ہوا تو بلاشبہ وہ لمحہ اس دعا کو مانگے کا لمحہ تھا۔ یہ دعا ایک غیر معمولی عارف اور غیر معمولی سیرت و کردار کی شخصیت کی زبان مبارک ہی سے ادا ہو سکتی ہے۔ جس میں سب کچھ تھا۔ بس دعا ہی نہیں تھی۔ خدا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس دعا کو سن کر حیرت میں پڑ جاتا۔ مگر عالم الغیب کو کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی۔ لیکن اس دعا نے صاحب عرش کے در پر اس طرح دستک دی کے ہر دروازہ کھل گیا۔ یہ ثمرہ بلاشبہ اس بات کا تھا کہ پکارنے والا آخری درجے میں اللہ تعالیٰ سے واقف ہے۔

مدنی زندگی کا واقعہ

دوسرا واقعہ وہ ہے جس کا تعلق انسانوں سے ہے اور یہ انصار مدینہ کے حوالے سے فتح مکہ کے بعد پیش آیا۔ اس وقت صورتحال بہت بدل چکی تھی۔ مکہ فتح ہو چکا تھا۔ حنین کی وادی میں یقینی

شکست کواللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت نے فتح میں بدل دیا تھا۔اس موقع پر مسلمانوں کو بہت زیادہ مال غنیمت ہاتھ لگا۔اس موقع پر مکہ کے ان نومسلموں کی بڑی تعداد جنگ میں شریک تھی جو ابھی ابھی ایمان لائے تھے۔بصیرت نبوی نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اس موقع پر ان کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کیا جائے گا تو اس کا دوہرا فائدہ ہوگا۔ایک یہ کہ فتح مکہ کے بعد گرچہ یہ لوگ ایمان لے آئے تھے،مگر یہ دراصل شکست خوردہ قوم کے لوگ تھے۔ان کی انا بری طرح مجروح ہوئی تھی۔ ایسے میں اگر ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کر دیا جائے تو یہ ہر پہلو سے اسلام کے مخلص خادم بن جائیں گے۔

بلاشبہ یہ سوچ ایک حقیقت بھی تھی جسے وقت نے سچ ثابت کر دکھایا۔کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب ہر طرف مرتدین، جھوٹے مدعیان نبوت اور منکرین زکوۃ نے بغاوت کر دی تھی تو اس وقت اہل مکہ پوری قوت کے ساتھ خلافت مدینہ کے ساتھ کھڑے رہے۔ اگر اہل مکہ بھی بغاوت کر دیتے تو پھر صورتحال کو سنبھالنا عملاً ناممکن تھا کیونکہ وہ صدیوں سے عرب کے سردار تھے۔ بغاوت کو قیادت مل جاتی تو خلافت ختم ہو جاتی ہے۔مگر رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے عفور و درگزر اور پھر اس احسان نے ان کے دل اس طرح جیت لیے کہ اس مشکل میں وہ ثابت قدم رہے۔

تاہم غزوہ حنین کے موقع پر ان پر کی جانے والی اِس خصوصی عنایت کی بنا پر قدیم الاسلام انصار اور خاص کر ان کے نوجوانوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم وطن اور ہم نسب قریش ایمان لے آئے ہیں۔اور اس موقع پر ان کو عطا کرنا اور انصار کو نہ دینا اس بات کی علامت ہے کہ ہماری حیثیت ختم ہو چکی ہے۔پھر ایک دوسرے پہلو سے انھیں اس عمل سے یہ محسوس ہوا کہ یہ ہماری خدمات کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔اس میں

کوئی شک نہیں کہ اسلام کی خدمت میں جو خدمات انصار کی تھیں اس میں ان کا مدمقابل عرب میں کوئی نہ تھا۔ پورے عرب کی دشمنی مول لے کر ایمان لانا اور مدینے کا اقتدار اپنی خوشی سے نبی اللہ کے حوالے کرنے سے لے کر ہر جنگ میں سب سے زیادہ شہادتیں دینا، مواخات میں اپنا مال واسباب مہاجرین میں برابر تقسیم کرنے سے لے کر غزوہ حنین تک اس وقت رسول اللہ کی پکار کا جواب دینا جب دوسرے لوگ بھاگ رہے ہوں، بہت بڑی بات ہے۔

ایسے میں مال غنیمت میں بڑے حصے کی توقع کرنا اور اسے نہ ملنے پر دل گرفتہ ہونا ایک فطری عمل تھا۔ چنانچہ یہ باتیں پھیلیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک بھی جا پہنچیں۔ اس پر آپ نے تمام انصار کو ایک جگہ جمع کیا۔ اس موقع پر جو انصار سے جو گفتگو آپ نے فرمائی وہ بلاشبہ انتہائی غیر معمولی گفتگو تھی۔

آپ کا خطبہ

اس موقع پر جو گفتگو آپ نے فرمائی وہ درج ذیل ہے:

اللہ کی حمد وثنا کے بعد آپ نے فرمایا:

''انصار کے لوگو! یہ تمہاری کیا چہ میگوئی ہے جو میرے علم میں آئی ہے! اور یہ کیا ناراضی ہے جو جی ہی جی میں تم نے مجھ پر محسوس کی ہے! کیا ایسا نہیں ہے کہ میں ایسی حالت میں تمہارے پاس آیا کہ تم گمراہ تھے، اللہ نے تمہیں ہدایت دی اور محتاج تھے، اللہ نے تمہیں غنی بنایا۔ اور باہم دشمن تھے، اللہ نے تمہارے دل جوڑ دیے؟ لوگوں نے کہا کیوں نہیں! اللہ اور اس کے رسول کا بڑا فضل وکرم ہے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، انصار کے لوگو! مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟ انصار نے عرض کیا، یارسول اللہ بھلا ہم آپ کو کیا جواب دیں؟ اللہ اور اس کے رسول کا بڑا فضل و

کرم ہے۔ آپ نے فرمایا: دیکھو! خدا کی قسم، اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو۔ اور سچ ہی کہو گے اور بات سچ ہی مانی جائے گی کہ آپ ہمارے پاس اس حالت میں آئے کہ آپ کو جھٹلا دیا گیا، ہم نے آپ کی تصدیق کی۔ آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا تھا، ہم نے آپ کی مدد کی۔ آپ کو دھتکار دیا گیا تھا، ہم نے آپ کو ٹھکانا دیا۔ آپ محتاج تھے، ہم نے آپ کی غمخواری وغمگساری کی۔

اے انصار کے لوگو! تم اپنے جی میں دنیا کی اس عارضی دولت کے لیے ناراض ہو گئے جس کے ذریعے سے میں نے لوگوں کا دل جوڑا تا کہ وہ مسلمان ہو جائیں اور تم کو تمہارے اسلام کے حوالے کر دیا تھا؟ اے انصار! کیا تم اس سے راضی نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم رسول اللہ کو لے کر اپنے ڈیروں میں پلٹو؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔ اگر سارے لوگ ایک راہ چلیں اور انصار دوسری راہ چلیں تو میں بھی انصار ہی کی راہ چلوں گا۔ اے اللہ رحم فرما انصار پر اور ان کے بیٹوں پر اور ان کے بیٹوں کے بیٹوں (پوتوں) پر۔''، (الرحیق المختوم، 571)

رسول اللہ صل اللہ علیہ وسلم کا یہ خطاب سن کر لوگ اس قدر روئے کہ ڈاڑھیاں تر ہو گئیں اور کہنے لگے: ہم راضی ہیں کہ ہمارے حصے اور نصیب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہو گئے اور لوگ بھی بکھر گئے۔

انسان کی معرفت

یہ خطبہ اس بات کی بہترین مثال ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کس طرح انسانوں کے مزاج کو سمجھنے والے تھے اور کتنی خوبصورتی سے آپ نے اس صورتحال کو کنٹرول کیا۔ پہلے قانون اور حقائق کی سطح پر مخاطب ہو کر ان پر یہ واضح کیا کہ نعمتِ ایمان سے لے کر دنیا میں ملنے والی فراخی، اقتدار اور غلبے کی جو کیفیت انصار کو آج حاصل ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ ہی

ہے۔انھوں نے بلا تامل یہ بات مان لی۔اگر آپ بات یہیں ختم کر دیتے تب بھی فوری مسئلہ ختم ہو جاتا۔مگر اس کے بعد جو کچھ آپ نے کہا کسی کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا۔آپ نے انصار کے فضائل اور احسان بیان کیے اور اس خوبی سے انصار کی خدمات کا اعتراف کہ پتھر سے پتھر دل بھی پگھل جائے اور عناد و ناراضی کی ہر کیفیت دور ہو جائے۔ پھر آخر میں یہ کہنا کہ اے نصار! کیا تم اس سے راضی نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم رسول اللہ کو ساتھ لے جاؤ تو گویا لوگوں کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دینے والی بات تھی۔اس کے بعد ممکن ہی نہیں تھا کہ شیطان کسی کے ذہن میں وسوسہ انگیزی کر کے اسے بہکا سکے۔ چنانچہ وفات رسول کے بعد جب انصار کے کچھ لوگوں نے خلافت کا استحقاق انصار کے لیے ثابت کرنا چاہا تو سیدنا ابوبکر نے اسی موقع پر کیے جانے والے کچھ دیگر ارشادات یاد دلا کر مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ ہونے سے بچایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی وہ بے مثل شخصیت تھی جس کے سامنے جو پتھر بھی آیا پگھل کر رہ گیا۔یہی شخصیت آج انسانیت کے سامنے پیش کرنے والی سب سے بڑی چیز ہے۔

”بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کر چھوڑی ہے اور ان کے لیے آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں نہ ان کا کوئی کارساز ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔جس میں ان کے چہرے آگ میں الٹے پلٹے جائیں گے۔ وہ کہیں گے: کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی! اور کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی بات مانی تو انھوں نے ہمیں راہ سے بھٹکا دیا۔: اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اور ان پر بہت بھاری لعنت کر!“، (احزاب 33:68-64)

مکاتیب

ابو یحییٰ

امتحان کی مختلف قسمیں

[ابو یحییٰ صاحب کی کتاب ''جب زندگی ہوگی'' کے حوالے سے ایک سوال پر یہ مکتوب تحریر کیا گیا۔مکتوب الیہ اور بعض دیگر اہل علم کے نام باوجوہ حذف کر دیے گئے ہیں، ادارہ۔]

برادر عزیز

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ہماری گفتگو تشنہ رہی۔لیکن اب یہ ممکن ہے کہ آپ کے اشکالات پر میں اپنا نقطہ نظر تفصیل سے بیان کر دوں۔ یہ ویسے بھی مولانا۔۔۔۔۔۔کا مجھ پر ایک ادھار ہے کہ اصل میں یہ اعتراض انہی کا تھا۔ چنانچہ واپس آ کر میں نے ان کی اس تحریر کو تلاش کیا جو ماہ اپریل میں آپ کے توسط سے مجھے ملی تھی، مگر ''قران کا مطلوب انسان' 'اور ''تیسری روشنی'' کی اشاعت اور کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر میں ابھی تک اس تحریر کو نہیں دیکھ سکا تھا۔آج اسے دیکھا تو وہ اعتراض واضح طور پر سامنے آ گیا جو''جب زندگی شروع ہوگی'' میں میرے بیان کردہ اس نقطہ نظر پر اٹھایا گیا ہے کہ اس دنیا میں اگر انسانیت کے بعض گروہوں کا امتحان جدا جدا ہے تو یہ دراصل ان کا اپنا انتخاب ہے، (صفحہ 80-81)۔

میں آپ کے یا مولانا۔۔۔۔۔۔صاحب کے اعتراضات کا بعد میں جواب دوں گا پہلے اپنا نقطہ نظر کچھ وضاحت سے پیش کرنا چاہوں گا کیونکہ میرا تاثر ہے کہ میری بات اور دلائل کو پوری طرح سمجھا ہی نہیں گیا۔ جب بات سمجھی ہی نہیں گئی تو کسی بھی قسم کی تردید اکثر اپنے اور دوسرے کے وقت کا زیاں بن جاتی ہے۔اس گنہہ گار پر اللہ تعالیٰ کا یہ بڑا کرم ہے کہ اس نے اپنی علمی اور

تحقیقی زندگی کی ابتدا ہی میں یہ اصول سمجھ لیا تھا کہ جب کسی پر تنقید کرنا مقصود ہو تو پہلے مرحلے پر اس کا نقطہ نظر پوری ہمدردی کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔ اس طرح کہ جب ہم اس کا نقطہ نظر بیان کریں تو وہ بھی کہہ اٹھے کہ بالکل درست بات بیان کی جا رہی ہے۔ اس کے لیے سوال کر کے بات کو سمجھا جاتا ہے۔ پہلے مرحلے پر ہی اگر سوال کے بجائے اعتراض شروع ہو جائے تو پھر ختم نہ ہونے والی بحث شروع ہو جاتی ہے جس کا کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس دنیا میں انسانی گروہوں کا امتحان یکساں نہیں۔ یہی وہ بات ہے جس سے میں نے اپنی کتاب میں یہ گفتگو شروع کی ہے۔ مگر اگلی بات جو ایک مسلمہ اور معلوم حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ امتحان میں اختلاف کی نوعیت یہ نہیں کہ جن نمائندہ گروہوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان سب کو بالکل الگ الگ پرچہ امتحان دے دیا ہے۔ بلکہ پہلے گروہ کو جو امتحان دیا گیا ہے، اگلے کو اسی کو مشکل تر کر کے دے دیا گیا ہے۔ یعنی عام انسان جو نبیوں کی امت میں پیدا نہیں ہوئے ان کا امتحان فطرت میں موجود عقیدہ توحید اور خیر و شر کے تصورات کے مطابق زندگی گزارنا ہے تو ایسا نہیں کہ اگلے گروہ کو اس ذمہ داری سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اگلا گروہ یعنی نبیوں کی امت کو ان کے ساتھ اگلا امتحان شریعت کی پاسداری کا بھی درپیش ہے۔ وہ فطرت کے تقاضوں کے مطابق اخلاقی رویہ کو بھی اپنائیں گے اور شریعت کے ضوابط و قواعد کی پابندی بھی ان کے لیے ضروری ہے۔ اس سے اگلا گروہ یعنی انبیاء کے زمانہ پانے والوں کی اصل ذمہ داری اگر یہ ہے کہ وہ نبیوں کی تصدیق، تائید اور نصرت ہر حال میں کریں تو ساتھ میں اخلاقیات اور شریعت کے مطالبات سے بھی انہیں کوئی استثنا حاصل نہیں ہے۔

اب اپنی بات سمجھانے کے لیے میں تینوں گروہوں کے کاملین کو لے لیتا ہوں۔ یعنی پہلے گروہ کا کامل شخص وہ ہوگا جو اپنے روایتی نقطہ نظر سے اوپر اٹھے گا اور توحید کو مان لے گا پھر ایک اعلیٰ

اخلاقی رویے کے مطابق زندگی گزارے گا۔ مگر ظاہر ہے کہ نہ اس تک شریعت کی رہنمائی پہنچی نہ وہ اس کے مطابق عبادات اور دیگر مطلوب اعمال کو اختیار کرے گا۔ یہی معاملہ نبی کے ایک امتی کا ہوگا کہ وہ کامل درجے پر اخلاقیات اور شریعت کے تقاضوں پر عمل کر بھی لے، اپنے فرقہ وارانہ تعصب سے اوپر اٹھ کر نبی کی تعلیم کے مطابق زندگی گزار بھی لے، تب بھی اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ نبی کی اس وقت تصدیق کرے جب دنیا اسے گلی بازاروں میں چلنے پھرنے والا، کھانے پینے والا ایک عام بشر مانتی تھی۔ نبی تو اس کا پیدائشی ہیرو اور اس کا تعصب ہے۔ وہ بہت تیر مارے گا تو بہت سے تصورات کی نفی کر کے نبی کی اصل بات تک جا پہنچے گا۔ ساتھ دے گا تو کسی ایسے ہی عالم کا دے گا جو اللہ کے نبی ہی کے نام پر کھڑا ہوگا۔ مگر پھر بھی نبی پہلے دن سے اس کا تعصب اور اس کی محبت ہوگا۔ جبکہ صحابی اس وقت نبی کی تصدیق کرتا ہے جب دنیا اسے کذاب، جادوگر، شاعر اور مجنون کہہ رہی ہوتی ہے۔ جب نبی اس کے تمام معبودوں کو معبودان باطل قرار دے رہا ہوتا ہے۔ نبی اس کے مصدقہ دینی معمولات کو جھوٹ کا پلندہ اور اس کے اسلاف کے طریقے کو گمراہی کا راستہ قرار دے رہا ہوتا ہے۔ ایسے میں نبی کی تصدیق وہ عمل ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بھی بلاشبہ بہت بڑا عمل ہے مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ جو میرے اور آپ جیسے کسی شخص کے لیے کرنا کسی صورت آج ممکن ہی نہیں الا یہ کہ کوئی نیا نبی آجائے اور یہ دروازہ اب قیامت تک کے لیے بند ہو چکا ہے۔

اب یہ فرمایئے کہ ان تینوں گروہوں کے کاملین کا اجر اگر برابر ہو تو اس سے بڑی زیادتی کیا ہوگی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص جو اخلاقیات کی پیروی کتنے ہی اعلیٰ طریقے پر کر رہا ہو؛ وہ اس کے برابر ہو جائے جو بہترین اخلاقی رویے کے ساتھ شریعت کے تقاضوں کی مشقت جھیلتا اور کثرت عبادت و ذکر سے لمحے لمحے میں خدا کا قرب ڈھونڈ رہا ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ شریعت اور اخلاقیات میں آج کا بہترین امتی اس صحابی کے برابر ہو جائے جو ان دونوں میں کمال رکھنے کے

ساتھ داخل کے ہر تعصب اور خارج کی ہر مخالفت کو جھیل کر وقت کے نبی کا ساتھ دے رہا ہو۔

ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم میٹرک، انٹر اور گریجویشن کرنے والے تین لوگوں کو ایک جیسا نہیں مانتے۔ چاہے سب نے فرسٹ ڈویژن میں امتحان پاس کیا ہوا۔ میٹرک فرسٹ ڈویژن کرنے والا انٹر فرسٹ ڈویژن کے اور انٹر فرسٹ ڈویژن گریجویشن کے برابر نہیں ہوسکتا۔ مگر آپ یہ فرماتے ہیں کہ نہیں جناب آج کا ایک بہترین مسلمان اجر میں انبیاء کرام سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ میٹرک اور انٹر فرسٹ ڈویژن سے کرنے والا ماسٹر فرسٹ کلاس فرسٹ ڈویژن میں کرنے والے انبیا سے جنت میں آگے کھڑا ہوسکتا ہے۔ کوئی معقول آدمی ایک لمحے کے لیے بھی یہ منطق ماننے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا۔

میرے نزدیک آپ کی اور برادرم مولانا ۔۔۔۔ کی غلط فہمی کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے امتحان کی نوعیت کو درست نہیں سمجھا۔ آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہر گروہ کا امتحان بالکل الگ نوعیت کا ہے۔ آپ کے فہم کی درست تمثیل یہ ہے کہ ایک شخص نے ماسٹرز انگریزی ادب میں اور دوسرے نے بھی ماسٹرز کیا ہے مگر اردو ادب میں۔ امتحان کا درجہ ایک ہے مگر امتحان مختلف ہے۔ اس لیے جس نے اپنا امتحان بہتر دیا وہ زیادہ قابل ہے اور اس کے نمبر زیادہ آئیں گے۔ جب کہ میں واضح کر چکا ہوں کہ حقیقت مختلف ہے۔ حقیقت میں امتحان کی نوعیت ہر گروہ کے لیے درجہ بہ درجہ سخت تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس پس منظر میں صحیح تقابل وہی ہے جو میں نے اوپر واضح کیا ہے کہ ایک گروہ نے میٹرک تک کا، دوسرے نے انٹر اور تیسرے نے گریجویشن تک کا امتحان دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لیے میٹرک فرسٹ ڈویژن کبھی گریجویشن فرسٹ ڈویژن کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اور چونکہ انبیا کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ ماسٹرز کرتے ہیں اور بہر حال فرسٹ ڈویژن ہی میں ٹاپ کرتے ہیں، اس لیے ان سے کم تر درجے کا کوئی شخص کسی صورت ان کے برابر نہیں پہنچ سکتا۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں وہ سوال اٹھ جاتا ہے کہ ایک شخص روز قیامت اللہ تعالیٰ پر یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ مجھے بطور نبی یا اس کے صحابی کے پیدا کیوں نہیں کیا گیا تا کہ میرا اجران جیسا ہوجاتا۔کیا یہ موقع نہ دیا جانا خلاف عدل نہیں؟ اس گنہہ گار نے اپنے ناول میں اسی اعتراض کا جواب دینے کی حقیر کوشش کی ہے۔مگر چونکہ یہ پہلی کاوش ہے اس لیے مخالفت ، اعتراض اور سوالات کی انہی آندھیوں کی زد میں ہے جو بالعموم ایک نئی چیز کا مقدر ہوتی ہے۔میرے نزدیک ہر گروہ نے امکانات وخطرات کو دیکھ کر اپنا امتحان خود چن لیا تھا۔تاہم جیسا کہ میں بار بار واضح کرتا رہا ہوں یہ میرا استنباط ہے نہ کہ قرآن مجید کا صریح بیان ہے۔

اس استنباط تک پہنچنے میں میری پہلی رہنمائی قرآن کریم کی بیان کردہ اس حقیقت نے کی ہے کہ انسان اس امتحان میں اپنی مرضی اور رضامندی سے ہے اور یہ کہ امتحان میں اترنے سے قبل اس سے پوچھا گیا تھا یہ بات قرآن مجید سورہ احزاب آیت 72 کی روشنی میں ثابت ہے۔چاہے آپ اس واقعے کو حقیقت مانیں یا تمثیل ،پیشکش اور اختیار کا ذکر اس میں واضح طور پر موجود ہے۔دوسری رہنمائی سورہ اعراف آیت 172 میں بیان کردہ یہ حقیقت ہے کہ اس دنیا میں آنے سے قبل تمام انسانوں کو ایک دفعہ ضرور پیدا کیا گیا تھا۔میری تیسری اور فیصلہ کن رہنمائی اللہ تعالیٰ کی ان صفات عالیہ کے بیان نے کی ہے جن سے قرآن کریم بھرا ہوا ہے۔اللہ کے عدل کا عین تقاضہ ہے کہ وہ اگر پوری انسانیت سے پوچھ کر اس امتحان میں بھیج رہا ہے تو امتحان کی ہر سطح میں بھی لوگوں کو پوچھ کر ہی بھیجنا چاہیے۔ظاہر ہے یہ واقعہ قرآن میں بیان ہوا ہے نہ اس کی ضرورت ہے،مگر میرے نزدیک قرآن مجید کے درج بالا دو بیانات اور صفات باری تعالیٰ کی جو تفصیل قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے ،وہ اس بات کا واضح قرینہ ہیں کہ بندوں پر رائی کے برابر ظلم نہ کرنے والا رب اتنی بے انصافی کا کام نہیں کرسکتا کہ بغیر پوچھے لوگوں کو اس طرح کے سخت امتحان میں دھکیل دے۔

اس ضمن کی آخری بات اس بات کی وضاحت ہے کہ میں اس بات کی کسی پہلو سے نفی نہیں کررہا کہ کم تر درجہ کے امتحان میں کامیاب ہونے والا یقیناً اس سے بہتر ہے جو برتر امتحان میں ناکام ہوجائے۔ اسی طرح کم تر درجہ کا امتحان دینے والے اگر اپنے امتحان میں اعلیٰ سطح پر کامیابی حاصل کرتا ہے تو یقیناً وہ باعتبار انجام اس شخص سے بہتر ہوگا جو برتر امتحان میں عام سی کارکردگی دکھائے۔ یہ بات عقل و نقل دونوں سے ثابت ہے اور میں نے اپنے ناول میں عبداللہ کے کردار کو ایک ایسی ہی شخصیت کے طور پر پیش کیا تھا جو پچھلوں میں سے تھا، مگر اپنی غیر معمولی کارکردگی کی بنا پر اس اعلیٰ مقام کا حقدار ہوا تھا جو اگلوں کا خاصہ ہے۔ تاہم کامل کا تقابل جب بھی کامل سے ہوگا تو برتر امتحان دینے والے ہی بڑے درجات کے حقدار ہوں گے۔ اس کے دلائل میں پیچھے دے چکا ہوں۔ اس میں مزید اضافہ یہ کر لیجیے انبیاء علیھم السلام کسی پہلو سے غیر کامل نہیں ہوتے اس لیے ان سے بڑھنا یا ان کے برابر آنا بھی ، میری ناقص رائے میں ، کسی کے لیے ممکن نہیں۔ میں اس ضمن میں کسی طور آپ دونوں حضرات کی اس رائے سے اتفاق کی کوئی گنجائش نہیں پاتا کہ ایک غیر نبی آخرت میں انبیاء علیہم السلام حتیٰ کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبے سے بھی بلند مرتبہ حاصل کرسکتا ہے۔

اس تفصیل کے بعد اس بات کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی کہ مولانا۔۔۔۔۔۔ کے اعتراضات کا کوئی جواب دیا جائے کیونکہ جس فہم پر ان کا نقطہ نظر قائم تھا وہ میں عرض کر چکا کہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مزید یہ کہ اپنے نقطہ نظر کے حق میں میں نے جو دلائل بعض سائلین کے جواب میں دیے اور ان کی خدمت میں بھی ایک نشست میں پیش کیے، انہوں نے ان کو بھی پوری طرح سمجھے بغیر ان پر دو اعتراضات کردیے۔ ان کے خط میں بیان کردہ اعتراضات اسی وقت کوئی وزن رکھتے جب میں یہ کہتا سورہ احزاب اور سورہ اعراف میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ وہی ہیں جن کو بطور ایک واقعہ

میں نے ناول میں بیان کیا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا میرے نزدیک ان آیات میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں وہ اس نتیجہ فکر کے مقدمات ہیں جو میں نے اخذ کیا ہے۔ یعنی سب انسان ایک دفعہ پیدا ہو چکے ہیں اور یہ کہ کل انسانیت اس دارالامتحان میں اللہ کی پیشکش کو قبول کرکے آئی ہے۔ میری تردید میں آپ کو ان آیات سے اگر کچھ ثابت کرنا ہے تو یہ ثابت کیجیے کہ ان آیات میں یہ حقائق بیان نہیں ہوئے۔ یہ ثابت کیجیے کہ اعراف 172 کی رو سے سارے انسان پہلے پیدا نہیں ہوئے۔ یہ ثابت کیجیے کہ احزاب 72 کی رو سے انسان کا اختیار ثابت نہیں ہوتا۔

بہرحال میں تو ان آیات سے یہی سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد میرے نزدیک اگر اللہ تعالیٰ کے عدل کا یہ تقاضہ ہے کہ انسانیت کو پوچھ کر امتحان کے لیے اس دنیا میں بھیجا جائے تو ایک ایسے وقت میں جب سارے انسان موجود تھے اور انسانوں کو درجہ بہ درجہ مشکل یا آسان نوعیت کے تین چار مختلف امتحانوں میں ڈالا جانا تھا تو عدل کا تقاضہ ہے کہ انھیں ان امتحانوں میں بھی ان کی مرضی دریافت کرکے بھیجا جائے۔ اور یہی میرے نزدیک ہوا ہوگا۔

اس کے بعد برادر عزیز مولانا۔۔۔۔۔ صاحب نے اپنے اس نقطہ نظر کے حق میں کچھ دلائل دیے ہیں جو آپ کا بھی ہے۔ یعنی ایک عام فرد اپنا امتحان اچھی طرح دے تو وہ چاہے وہ نبیوں کی ہدایت سے محروم ایک عام انسان ہو یا ایک مسلمان، درجات میں صحابہ اور انبیا کرام حتیٰ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بلند درجات حاصل کرسکتا ہے۔ گرچہ میں عقلی طور پر اس مقدمے کا غلط اور عدل کے خلاف ہونا ثابت کرچکا ہوں، لیکن مناسب ہوگا کہ ان دلائل کا بھی جائزہ لے لیا جائے جو انھوں نے اپنی بات کے حق میں قرآن کریم سے پیش کیے ہیں۔

برادر عزیز مولانا۔۔۔۔۔ نے اپنے اس نقطہ نظر کے حق میں کہ کوئی بھی شخص کہیں بھی پیدا ہو جنت میں انعام وانجام یکساں ہوگا تین آیات پیش کی ہیں۔ اس عاجز کے نزدیک قرآن کریم کی

ان آیات کا اصل مدعا یہ ہے کہ سب کامیاب لوگ جنت میں جائیں گے اور اپنے عمل کے لحاظ سے درجہ پائیں گے۔ یہ بات کہ جنت میں سب لوگوں کے درجات برابر برابر ہوں گے، بہت معذرت کے ساتھ اس کی کوئی دلیل نہ ان آیات میں ہے اور نہ قرآن مجید کی کسی اور آیت میں۔انہوں نے جو آیات نقل کی ہیں وہ صرف یہ بتاتی ہیں، کامیاب لوگوں کا ایک ہی انجام ہے وہ جنت ہے۔ یہ نہیں بتارہی رہیں کہ جنت میں سب کے درجات برابر ہیں۔ مثلا پہلی آیت وہ سورہ نساء کی آیت 66 ہیں۔ یہ آیت صرف یہ بتارہی ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والے انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ ہوں گے۔ اس آیت کا مطلب بالکل سادہ ہے کہ یہ جنت میں ان کے ساتھ ہوں گے۔ یہ بیان نجات ہے۔ اس بات کا بیان نہیں کہ نبی کی اطاعت کرنے والے نبی سے آگے بڑھ جائیں گے۔

قرآن کی اس بات کو ایک عام مثال سے سمجھیں تو یہ مطلب ہے کہ جو لوگ پیسے رکھتے ہیں وہ شہر کے پوش علاقے میں وزیروں، مشیروں اور امیروں کے ساتھ گھر خرید کر رہ سکتے ہیں۔ اس جملہ کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ مقام و مرتبے اور دولت میں ان سے زیادہ ہو جائیں گے۔ یہی قرآن کی دعوت ہے کہ اطاعت کی پونجی جمع کرنے والے جنت کی بستی میں انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ گھر خرید سکتے ہیں۔ قرآن یہاں نجات یافتہ ہونے کی بات کر رہا ہے، جنت میں داخلے کی بات کر رہا ہے۔ اس حیثیت میں تمام نجات پانے والے لوگ یقیناً برابر ہیں کہ ہر کامیاب شخص چاہے ایک نبی ہو یا قیامت سے قبل کا کوئی عام آدمی جنت ہی میں ہوگا۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس جنت میں ان کا انعام و مقام یکساں ہوگا۔ اس آیت میں اس بات کی سرے سے کوئی وضاحت نہیں۔ یہاں اصل شرط اطاعت بیان ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ نبی کی اطاعت ایسی کون سی بڑی چیز ہے جس کے نتیجے میں ایک شخص اجر میں نبی سے بھی بڑھ جائے۔ نبی تو اطاعت بھی

کرتا ہے اور دعوت دین کی زبردست جدوجہد بھی کرتا ہے۔اخلاق کامل کا نمونہ بھی ہوتا ہے اور شریعت پر سب سے بڑھ کر عمل کرنے والا بھی۔محض اس کی اطاعت، چاہے وہ کتنی اعلیٰ سطح پر کی جائے، یہ کیسے لازم کردیتی ہے کہ اطاعت کرنے والا اس کے برابر پہنچ گیا یا اس سے بڑھ گیا۔

دوسری آیت سورہ توبہ کی آیت نمبر 100 ہے۔اس میں آپ کا کہنا ہے کہ سابقین الاولین کے ساتھ متبعین کا ذکر اور سب کو ایک نوید سنانا آپ کے نظر نظر کی تصویب کرتا ہے۔میرے نزدیک یہاں بھی مسئلہ وہی ہے۔ یہاں سب لوگوں کو جو خوشخبری دی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی رضا اور جنت کے حقدار ہیں۔ظاہر ہے کہ اس معاملے میں سب کامیاب اور نجات یافتہ لوگ یکساں ہیں کہ وہ جنت میں جائیں گے اور اللہ کی رضا حاصل کریں گے۔اس سے یہ نتیجہ کیسے نکل رہا ہے کہ ہر شخص کے لیے اللہ کی رضا کا درجہ اور جنت میں سب کا مقام بالکل ایک جیسا ہوگا۔

تیسری آیت سورہ واقعہ 16-14 ہے۔سورہ واقعہ کی ابتدائی آیات کا اصل اور بنیادی پیغام یہی ہے کہ انسانیت روز قیامت دو حصوں میں تقسیم ہوگی۔ایک کامیاب لوگ جو جنت میں ہوں گے اور دوسرے ناکام جو جہنم میں ہوں گے۔البتہ اس پہلو سے یہ مقام اہم ہے کہ اس میں اہل جنت کو درجات کے حساب سے دو بڑی قسموں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ایک اصحاب الیمین جو عام جنتی ہیں اور اور دوسرے السابقون۔السابقون کے لفظ سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے میں سبقت لے جانے والے لوگ ہیں۔قرآن اس مقام پر یہ بیان کرتا ہے کہ یہ اگلوں میں سے بہت اور تھوڑے پچھلوں میں سے بھی ہوں گے۔یہی وہ بات ہے جو ایک آخری وضاحت کے عنوان سے میں نے پیچھے بیان کی ہے۔یعنی ایسے سابقون جو قربانی کے درجے پر دین کے تقاضوں کو نبھاتے ہوں چاہے وہ بعد کے ادوار میں آئے ہوں انہیں اللہ کی قربت کا وہی مقام ملنا چاہیے جو اگلوں کو ملا ہے۔اس پہلو سے یقیناً ان آیات میں بعد میں آنے

والوں کے لیے ایک بڑی خوشخبری ہے کہ وہ بھی سبقت کی راہ اختیار کر کے قرب کا مقام پا سکتے ہیں۔ مگر اس آیت کا یہ مطلب کسی صورت نہیں کہ آج کے دور کا ایک کامل امتی نبی کے دور کے کامل امتی کے برابر ہو سکتا ہے۔ آج کا کوئی شخص ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ بلکہ حضرات انبیا علیھم السلام سے بھی آگے بڑھ سکتا ہے۔ جیسا کہ شروع میں عرض کیا اس کا کوئی امکان نہیں۔ کیونکہ انھوں نے مشکل ترین پرچہ لیا اور احسن ترین طریقے پر اسے نبھایا۔ جبکہ آج کا مسلمان کتنا ہی مشکل پرچہ اٹھالے وہ بہر حال انبیا اور ابتدائی دور نبوت کے مقابلے میں ہلکا ہی ہے۔

یہی وہ بات ہے کہ جو اگلی سورت یعنی الحدید میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔

''تم میں سے جو لوگ فتح (مکہ) سے پہلے انفاق و جہاد کریں گے (اور جو بعد میں انفاق و جہاد کریں گے) یکساں نہیں ہو گے۔ ان لوگوں کا درجہ ان سے بڑا ہو گا جو بعد میں انفاق و جہاد کریں گے۔ اگرچہ اللہ کا وعدہ ان میں سے ہر ایک سے اچھا ہی ہے۔''، (الحدید 10:57)

یہی وہ آیت ہے جو بتاتی ہے کہ بعد میں آنے والے جہاد و انفاق جیسی اعلیٰ ترین عبادات کر کے بھی بہر حال اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے جو ابتدائی صحابہ کا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ دونوں مقربین کے مقام پر ہوں۔ مگر بڑا درجہ ہر حال میں انھی لوگوں کا ہے۔ اس حقیقت کو میں ایک تمثیل سے پیچھے بیان کر چکا ہوں کہ پوش علاقے میں گھر لینا گرچہ انسان کا اسٹیٹس بڑھا دیتا ہے اور وہ طبقہ امراء ہی میں شمار ہوتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسی علاقے میں رہنے والے وزیر اعظم اور وزرا کی ہمسری کا دعویٰ بھی کر سکتا ہے۔

یہ اس حوالے سے میری معروضات تھیں۔ ان میں سے جو بات صحیح ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو غلط ہے وہ میرے اپنے نفس کی کوتاہی ہے۔

والسلام علیکم

فرح رضوان (کینیڈا)

وظیفے کا کرشمہ

رضیہ بھی ہر روز کی جھک جھک سے تنگ آ چکی تھی۔اس لیے اپنی بہن کی بات کو بہت دھیان سے سن رہی تھی۔رضیہ کے میاں کا غصّہ اس سے چھپا ہوا نہیں تھا۔وہ گھٹی گھٹی رہتی اور بچے سہمے رہتے تھے۔وہ میاں کے لیے طرح طرح کے کھانے بناتی ،وقت پر اسکے کپڑے تیار رکھتی ،اس کے رشتے داروں کی خوب خاطر مدارات کرتی ،لیکن میاں کی بدمزاجی میں کمی نہ آتی۔ور گونگی تو وہ بھی نہ تھی۔سو اس اکثر ظلم کے خلاف بول اٹھتی ،اور یوں جھگڑے کی ایک نہ ختم ہونے والی ابتدا ہو جاتی۔جاننے والوں میں کوئی کہتا کہ نظر لگ گئی ہے۔کوئی کہتا یہ تو جادو یا بندش کا معاملہ لگتا ہے۔انہی خدشات کو ذہن میں رکھ کر اس کی بہن کسی خاتون کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے رضیہ کو اس کے پاس چلنے پر اکسا رہی تھی۔

’’بجو!ایمان سے وہ کوئی جعلی پیر نہیں ،ایک پیسہ نہیں لیتی ،جب سے ہمارے محلے میں آئی ہے کتنے گھروں کے جھگڑے ختم ہو گئے ہیں، بڑی اللہ والی عورت ہے بڑے زبردست وظیفے بتاتی ہے۔‘‘

اور آخر کار اگلے دن دونوں وہاں پہنچ گئیں۔رضیہ کو زیادہ نہیں بتانا پڑا۔خاتون خود ہی آگے سے آگے بولے جا رہی تھیں۔وہ اندر ہی اندر "باجی " کی پہنچ کی قائل ہو چکی تھی ،لیکن یہ کیا ! باجی نے اس کا کیس ہاتھ میں لینے سے صاف انکار کر دیا۔پھر دوسری خاتون کو بلانے کا اشارہ کیا۔رضیہ نے بہت کوشش کی لیکن وہ نہ پیسے لے کر مانی نہ منت سماجت پر۔اس کا کہنا تھا کہ وظیفہ بہت کٹھن ہے۔تین ماہ میں ایک دن بھی کسی عمل میں کمی ہو گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔،رضیہ نے بڑے برے دن دیکھے تھے،وہ وہیں کونے میں دبک کر باقی عورتوں کے جانے کا

انتظار کرتی رہی ۔ جب سب چلی گئیں، تو باجی نے اسے خود ہی بلا کر سمجھایا کہ دیکھو بی بی تمہارے میاں جس قدر جلال میں آ جاتے ہیں ان کے علاج کے لیے وظیفہ بھی بہت ہی جلالی کرنا ہوگا اور اس کے لیے تم کو بہت مشقت کرنی ہو گی ۔ کچھ احتیاط تو شروع کے نوے دن کرنی ہے باقی تاحیات کرنی ہوں گی ۔ رضیہ نے رورو کر ان سے پکّا وعدہ کیا کہ آپ جیسا کہیں گی میں بالکل ویسی ہی پابندی کروں گی ۔ عہد و پیمان کے مکمل ہونے کے بعد باجی نے کچھ ڈبّے کھول کر مختلف سفوف نکال کر رضیہ کو تھماتے ہوئے ان کے استعمال کا طریقہ بتانا شروع کیا ۔ طویل فہرست تھی جو اسے یاد رکھنے کے لیے لکھنی پڑی ۔ وہ گھر لوٹی تو اس نے بہت سوچ بچار کر یہ فیصلہ کیا کہ وظیفہ فوری شروع نہ کیا جائے ، کیونکہ اس کے لیے جو شرطیں لازمی پوری کرنی تھیں ان کو پورا کرنے میں تقریباً ہفتہ درکار ہوگا ۔ ہر وہ کپڑا جو اس نے یا بچوں نے ایک بار بھی پہنا ہو ان کو دھو کر رکھنا تھا ، گھر کے در و دیوار کا ہر کپڑا جو دھل سکے اسے دھونا تھا ۔ سو پہلے روز ، تین دن کا کھانا اکھٹا بنا کر رکھا ، پھر ساری الماریاں اس بہانے صاف ہو گئیں ، کچھ غریبوں کا بھی بھلا ہو گیا کہ فالتو کپڑے انھیں دے ڈالے ۔ یہاں تک کہ سردیوں میں تین تین ماہ متواتر پہنے جانے والے کوٹ جو گزشتہ تین سال سے ڈرائی کلین نہیں ہو پائے تھے ان کے بھی دن پھر گئے ۔ اگلا مرحلہ در و دیوار تھے ۔ برسوں بعد آج گھر کے پردوں کو کھڑکیوں سے جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑ رہا تھا ۔ اگلی باری اندھیری اور نمی والی جگہوں کی تھی جہاں کچھ سفوف چھپا کر رکھنے تھے ۔ یوں وظیفہ شروع کرنے کا دن آ پہنچا ۔ اس کا دل سوال کیے جا رہا تھا کہ اتنی جان مارنے کے بعد بھی کچھ نہ ہوا تو ؟ لیکن آج سے اس کے منفی سوچنے ، کڑھنے اور غصّہ کرنے وغیرہ سب پر اگلے تین ماہ کے لیے سخت پابندی تھی ، اور ان سب سے نجات کے لیے اسے کثرت سے الحمدللّٰہ کا ورد کرنا تھا ۔ یہ الگ بات ہے کہ ورد کرتے کرتے خود بخود اسے زندگی میں ان گنت مثبت باتیں بھی نظر آنی شروع ہو گئیں اور

وہ اپنی ناشکری پر استغفار کے ساتھ ہی ان نعمتوں پر شکر کرنے کی عادی ہوتی گئی۔

دوسرے اوراد بھی پڑھنے میں تو آسان ہی تھے لیکن ان کے انتظامات بہت تھے، صبح والا وظیفہ رات کو پہنے ہوئے کپڑوں میں نہیں پڑھا جانا تھا، اب لازمی اسے بچوں کو ڈراپ کرنے سے پہلے حلیہ ٹھیک کرنا پڑتا، دوپہر والے کے لیے تو بہت کوشش کرنی پڑتی، اس کے لیے رضیہ نے حل یہ نکالا کہ وہ ناشتے کے فوراً بعد نہ صرف کھانا بناتی بلکہ ساتھ ہی موم بتی بھی جلا کر رکھتی تاکہ کچے گوشت اور مصالحوں اور سبزیوں اور دالوں کی بو اس کے محنت سے صاف کی پردوں اور الماریوں میں نہ جذب ہو سکے، ورنہ اسے دوبارہ اسی مشقت سے گزرنا پڑتا، لیکن اب وہ پہلے والی آزادی کہاں تھی اب تو کھانا پکانے کے بعد لازمی اسے نہا دھو کر کپڑے تبدیل کرنے پڑتے، ابھی شروع ہی کے دن تھے کہ کسی بات پر میاں صاحب غضب ناک ہو اٹھے۔ رضیہ کے ضبط کا بندھن ٹوٹنے کو تھا کہ اسے باجی کی دی ہوئی نصیحت اور پڑھی ہوئی دارچینی یاد آ گئی اس نے جھٹ سے دارچینی کا ٹکڑا دانتوں کے بیچ رکھا اور، جتنی زور سے شوہر پر غصہ آیا اتنی زور سے اسے دباتی گئی یہاں تک کہ سخت مرچیں لگنے پر اسے پانی پینا پڑا، پانی پی کر رہا سہا غصہ بھی ٹھنڈا ہو گیا، اور ہر بار یہی ہوتا، حتی کہ یہ کرامت بھی ظاہر ہو گئی کہ میاں صاحب نے خود ہی اپنے رویے پر ندامت کا اظہار کرنا شروع کر دیا، دن گزرتے رہے اور ہر دن دوسرے سے بہتر ہوتا چلا گیا، گھر کے ہر فرد میں ماحول میں کئی مثبت تبدیلیاں رونما ہونی شروع ہو گئیں تھیں، تین ماہ گزرنے تک حالات مثالی ہو گئے تھے۔ رضیہ ؛ باجی کا شکریہ ادا کرنے پہنچی تو وہ اس کی روداد سن کر بہت خوش ہوئیں اور مسکرا کر کہنے لگیں کہ بیٹی !تم جیسی نادان بچیوں کو اللہ تعالیٰ جعلی عاملوں سے محفوظ رکھے۔ تمھارے گھر کا تمام بگاڑ تمھارے ناقص ٹائم مینجمنٹ اور سخت لاپرواہی کی وجہ سے تھا۔ بس وہ کمزور پہلو کو درست کرتے ہیماشاللہ زندگی خوشگوار ہو گئی، جب تم پہلی بار میرے پاس آئی تھیں، مجھے اسی وقت تمہارا اسٹیٹ آف مائنڈ

سمجھ آ گیا تھا کہ اگر میں تم کو براہ راست یہ کہہ کر روانہ کر دوں کہ بی بی جاؤ اپنا دھیان رکھو تو تم کبھی سمجھ نہ پاتی کیونکہ دو اسکول جانے والے بچوں کے ساتھ یہ ہو نہیں سکتا تھا۔ کسی بھی دوست رشتے دار نے کھلے یا ڈھکے چھپے تمہاری توجہ اس طرف نہ دلائی۔ بعض اوقات انسان اپنی عادتوں کا اسیر ہو جاتا ہے۔ یہی تمھارے میاں اور تمہارے ساتھ ہوا۔ گھر گرہستی کے کاموں میں تم خود فراموشی کا شکار ہوتی چلی گئیں، میاں غیر شعوری طور پر عادی تو ہوتے گئے، لیکن لاشعوری طور پر راضی نہ ہو سکے۔ میں نے تمہیں غصّہ نہ کرنے کی سخت تاکید اس لیے کی تھی کہ مسلسل کڑھتے رہنے کی وجہ سے جسم سے ایسے مادوں کا اخراج شروع ہو جاتا ہے جن کی بو نہانے کے باوجود بھی ختم نہیں ہو پاتی۔ جو سفید سفوف میں نے تمہیں دیا تھا وہ کوئی کرشماتی چیز نہیں تھا بلکہ سادہ سا پھٹکری کا پاؤڈر تھا جو کہ بہترین antiperspirant ہوتا ہے۔ کچھ تو مردوں کو تعریف کرنے کا سلیقہ نہیں آتا اور جب بیوی خود سلیقے سے نہ رہے بچوں اور گھر کو سلیقے سے نہ رکھے تو وہ غصّہ بھی کرتے ہیں۔ وہ نہ خود وجہ سمجھ پاتے ہیں نہ سمجھا پاتے ہیں۔ بس بات بات پر الجھنے لگتے ہیں، جب تم نے ان سب باتوں پر توجہ دی تو حالات سدھر گئے۔

سچ کہو کہ اگر میں تم سے کہتی کہ بیٹا جب میاں کو غصّہ آیا کرے تو تم ہر صورت خاموش رہا کرو تو کیا یہ بات تم خود نہیں جانتی تھیں۔ رضیہ جو حیرانی سے اب تک سب کچھ سن رہی تھی ندامت سے گردن ہلاتی ہوئی بولی کہ باجی ہر جھگڑے کے بعد میں خود کو کوستی کہ کاش میں چپ رہ جاتی تو بات ہی نہ بڑھتی لیکن جب وہ غلط الزام لگانے شروع کر دیتے تب تو...... باجی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا کہ رضیہ تمہارا ایمان کیا کہتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غلط ہو سکتے تھے؟ رضیہ نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ بولیں کہ ایک بار ایک آدمی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کسی بات پر بحث کرنے لگا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں موجود تھے، وہ آدمی

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہتا رہا اور وہ خاموشی سے سنتے رہے جبکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے رہے، لیکن جیسے ہی اس شخص سے تنگ آ کر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے جواب دیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سخت غصے میں وہاں سے اٹھ کر جانے لگے ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے لپکے اور ناراضگی کی وجہ دریافت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ تم جب تک خاموش رہے تمہاری جانب سے ایک فرشتہ اس شخص کو جواب دے رہا تھا لیکن جب تم نے جواب دیا تو وہاں شیطان آ گیا۔ پھر باجی ہنستے ہوئے بولیں کہ اب سے غصہ آئے تو دارچینی چبا کر منہ بند رکھو گی یا اس یقین سے کہ ایک فرشتہ تمہاری جانب سے جواب دینے پر متعین ہے اور وہ اس وقت تک جواب دیتا رہے گا جب تک تم خاموش رہو گی۔ رضیہ بھی ہنسنے لگی کہ باجی میں تو سمجھی تھی کہ دارچینی پر آپ نے زبردست عمل کیا ہوا ہے، واقعی میرے خاموشی اختیار کرنے سے حیرت انگیز طور پر یہ ہونے لگا کہ کچھ دیر غصّہ کرنے کے بعد یا کچھ دن کے بعد میاں صاحب وہی کہتے یا کرتے جو میں چاہ رہی ہوتی، پھر ساتھ ہی ایک سوال اور داغ دیا، باجی! اس بات کا تو مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تین ماہ کا وقت میری عادتوں اور روٹین کو پکا کرنے کے لیے ضروری تھا لیکن گھر میں خوشبو اور میرے پاس سے خوشبو کا تعلق بھی وظیفے سے نہیں؟ باجی نے شفقت سے کہا کہ رضیہ! تھوڑا سا ذہن پر زور دو تو یہ بات سمجھ آ جائے گی کہ خواتین کو نامحرم کے سامنے زینت اور تیز مہک سے کیوں روکا گیا ہے، اور شوہر کے لیے اسی اہتمام کا کس قدر ثواب - ہم بچپن سے پڑھتے ہیں کہ صفائی نصف ایمان ہے، نوجوانی میں علم ہوتا ہے کہ نکاح کے ذریعے آدھا دین محفوظ ہو جاتا ہے، لیکن شادی کو دو سال نہیں گزرتے کہ سارے سبق محو ہو جاتے ہیں، کبھی نہ بھولنا کہ جب میاں بیوی ایک دوسرے کو محبت سے دیکھتے ہیں تو اللہ ان کو رحمت سے دیکھتا ہے، اور رب کی اس نظر رحمت کے لیے عورت کو اپنی محنت، حکمت اخلاق، صبر، درگزر اور مستقل مزاجی

سے ماحول بنانا پڑتا ہے۔

ہمارا بہت بڑا المیہ ہے کہ بہت سی مسلمان خواتین تو غیر مسلم سوسائٹی میں اپنا آپ منوانے کے لیے ان میں اتنا رچ بس جاتی ہیں کہ، پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ مسلمان ہیں ،اور جن کے پہناوے سے ان کے مسلمان ہونے کا پتہ چلتا ہے ان میں اکثر ایسی خواتین ہوتی ہیں جو باہر جاتے ہوئے ستر پوشی کا تو خیال رکھتی ہیں مگر personal hygiene and appearance کو یکسر فراموش کر دیتی ہیں۔کاش وہ جان سکیں کہ بحیثیت مسلمان وہ اپنے ہر عمل سے یا تو ایک غیر مسلم کو دعوت دین دے رہی ہوتی ہیں یا اسے دین سے متنفر کرنے کی مرتکب ہو رہی ہوتی ہیں، جب وہ سکول سے واپسی پر سودا لینے جاتی ہے، جب وہ کسی غیر مسلم پڑوسن یا اس کے بچے کو اپنی کار میں لفٹ دیتی ہے،اور کار کے اندر بکھری چیزیں اور خاتون سے اٹھتے ہوئے ناپسندیدہ، بھبکے اے سی یا ہیٹنگ کی وجہ سے بند گاڑی میں گردش کرتی ہوا ، ہر سانس کے ساتھ ان کے حلق میں پھنس جاتے ہیں تو ان تک کیا پیغام پہنچتا ہوگا، وہ اہم مشن جو ہماری اولین ذمہ داری ہے،اس مجرمانہ غفلت کی وجہ سے اسے کتنا نقصان پہنچتا ہے کاش ہم سمجھ پائیں۔ ہمیں تو ہر کام احسن طریقے سے کرنے کا حکم ہے تو اب کوئی دیکھے نہ دیکھے اللہ تو دیکھ رہا ہے، وہ تو نیت جانتا ہے،اور اعمال فرشتے لکھ رہے ہیں۔

جو لوگ اپنے سینے میں تعصب کے ناگ پالتے ہیں
وہ سب سے پہلے خود ہی ان کے زہر کا نشانہ بنتے ہیں

گواہی

(پروین سلطانہ حنا)

اے عرش والو ! تمھارا مقام کیا کہنا
گلہ مجھے بھی نہیں اپنی نارسائی کا
مرے نصیب پہ ایسا عروج آیا ہے
ستارا میرے مقدر کا جگمگایا ہے
مجھ ایسی خاک نشیں کا مقام تو دیکھو
کہ مجھ کو پھر مرے سرکار نے بلایا ہے
گواہی دینا مری اے ہوائے خاکِ حرم
جہاں پڑے تھے رسولِ خداؐ کے پاک قدم
وہاں وہاں میں نے اپنی جبیں جھکائی ہے
اذانِ صحنِ حرم کی صدائیں جب گونجیں
شریک ان میں مرے دل کی یہ گواہی ہے
خدائے پاک ! احد ہے کہ لا شریک ہے تو
ہر ایک تارِ رگِ جاں سے بھی قریب ہے تو